فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۵۳

جنوری سنہ ۱۹۴۴ء تا جون سنہ ۱۹۴۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شعراء

فہرست مضامین

جلد ۵۳

جنوری سنہ ۱۹۴۴ء تا جون سنہ ۱۹۴۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۵۳ ماہ محرم الحرام ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۴ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

اُردو اور ہندوستانی کے مقابلہ میں ایک نئی زبان "ہندی ہندستانی" کی پُرفریب اصطلاح سب سے اوّل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور ۱۹۳۶ء میں وضع ہوئی پھر یہیں "ودیا مندر" کی اُردو کش تعلیمی اسکیم مرتب ہوئی، آج بھی اُردو نوازی میں صوبہ متوسط بہت "نیک نام" ہے، اس لئے یہاں اردو کے بقا وتحفظ کے لئے خدامِ اردو کی خاص توجہ کی ضرورت تھی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب عرصہ سے اس فرض کو انجام دے رہے تھے، اب اس سلسلہ میں کل ہند انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ جنوری ۱۹۴۴ء کو نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی صدارت میں بڑے اہتمام سے ناگپور میں منعقد ہوا ہے اور اس میں اردو زبان وادب کی اشاعت وترقی کے لئے بہت اہم تجاویز پیش ہونگی، توقع ہے کہ یہ اجلاس اردو کی عام نشر واشاعت خصوصاً صوبہ متوسط میں اس کے تحفظ اور ترقی کے مفید عملی نتائج پر مشتمل ہوگا،

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے عربی کے دس دیوان ہیں، اب تک ان کے مکمل چھپنے کی نوبت نہیں آئی عرصہ ہوا حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھنؤ کے عربی رسالہ البیان میں پہلے سات دیوانوں کا جو سبعہ سیارہ کے نام سے موسوم ہیں انتخاب شائع کیا تھا، آسی پریس نے اس انتخاب کو علٰحدہ کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا تھا جو شاید اب بھی کتب فروشوں کے یہاں ملتا ہو، آخری تینوں دیوان یعنی آٹھوئیں نوئیں، اور دسوئیں مکمل کمیاب تھے، مولانا راغب صاحب بدایونی لکچرار شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈہ نے ان کو تلاش کرکے حاصل کیا ہے اور ان کو تصحیح وتحشیہ کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں

جن اصحابِ علم کے پاس ان دواوین یا آزاد کی مثنوی مظہر العجائب کا کوئی نسخہ ہو وہ مہربانی کرکے مولانا موصوف کو اس سے مطلع فرمائیں، یہ ایک علمی خدمت ہوگی، دسویں دیوان کے آخر میں آزاد کے قلم سے دسوں دیوانوں کی تصنیف کے مختصر حالات ہیں، مثنوی مظہر البرکات کا ایک عمدہ نسخہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں موجود ہے،

انجمن عربی صوبہ متحدہ الٰہ آباد کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مسلمان طلبہ میں عربی زبان کی تعلیم کی ترغیب وتشویق اور ان کی حوصلہ افزائی کا کام عرصہ سے انجام دے رہی ہے، اس سلسلہ میں اس نے گذشتہ سال ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب لکچرار عربی گورنمنٹ کالج لاہور کے انگریزی رسالے "ہم عربی زبان کیوں سیکھیں" (why we learn The Arabic language) کی بہت سی کاپیاں لکھنؤ، الٰہ آباد اور علی گڈہ کی یونیورسٹیوں کے ایم اے کے طلبہ میں مفت تقسیم کیں، اب وہ ہائی اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کے عربی طلبہ میں تقسیم کرنے کے لئے اس کا اردو ترجمہ شائع کرنا چاہتی ہے، کاغذ کی گرانی کی وجہ سے اس میں کافی مصارف ہوں گے، جس کا تحمل تنہا انجمن مذکور کے لئے دشوار ہے، اس لئے جو اصحاب خیر اس میں مالی مدد دینا چاہیں وہ پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب نمبر ۱ ایلی روڈ الٰہ آباد سے خط وکتابت فرمائیں،

حیدرآباد کے ایک خانگی کتب خانہ میں حافظ ابن قیم جوزی کی جانب منسوب ایک کتاب "احکام اہل الذمہ" دستیاب ہوئی ہے، مصنف کے کل پچاس ساٹھ سال بعد کی لکھی ہوئی ہے، اس کی ضخامت چھ سو صفحات ہے، کتاب کے آخر میں لکھا ہے کہ "دوسرے حصہ میں دلیل خامس سے بیان شروع ہوگا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اور بھی حصے ہیں، ابن جوزی کی معلوم کتابوں میں اس کتاب کا نام نہیں ہے اور نہ دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کی فہرستوں میں اس کا کوئی ذکر ہے، اگر کسی صاحبِ علم

کی واقفیت میں اس کتاب کا کوئی اور نسخہ خصوصاً دوسرا حصہ ہو تو اس سے مطلع فرمائیں،
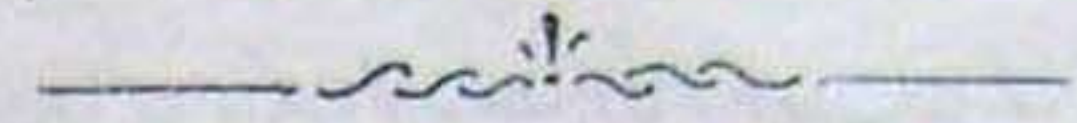
دار المصنفین میں تاریخ اسلام کا جو وسیع سلسلہ شروع کیا گیا تھا وہ بحمد اللہ ختم کے قریب ہے، اس میں تیرہ صدیوں کے اندر دنیائے اسلام میں جتنی بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوئیں ان سب کی سیاسی علمی اور تمدنی تاریخ ہوگی، اس سلسلہ کی تیسری جلد بنی عباس کی تاریخ کا پہلا حصہ زیر طباعت ہے، عباسی حکومت کسی نہ کسی شکل میں تقریباً پانچ سو برس تک قائم رہی اور اس کے گوناگوں علمی و تمدنی کارنامے ہیں، اس لئے اس کو تین حصوں میں تقسیم کردینا پڑا، پہلے حصہ میں عہد عروج کی تاریخ ہے، دوسرے میں دور زوال کی، تیسرا حصہ علمی اور تمدنی کارناموں پر مشتمل ہوگا، تاریخ ہند کے سلسلہ کے بعض حصے بھی تیار ہیں، امید ہے کہ اس سال اس کا پہلا حصہ جو سندھ میں اسلامی حکومت کی تاریخ کے متعلق ہے، پریس میں چلا جائے،

گذشتہ معارف میں حیات شبلی کی تیاری کی اطلاع دی جاچکی ہے، صرف تصویروں کے بلاک کی تیاری میں کچھ دیر ہوگئی تھی، اب تصویریں بھی چھپ گئی ہیں، اور کتاب بالکل تیار ہے، اس کی ضخامت مع مقدمہ اور دیباچہ وغیرہ کے ۹۲۰ صفحے ہے، دار المصنفین، ندوہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور شبلی انٹر کالج کی عمارتوں کے ۱۳ ہاف ٹون بلاک فوٹو ہیں، کاغذ اور دوسرے سامان طباعت کی موجودہ گرانی کے اعتبار سے کتاب کی تیاری پر بڑی لاگت آئی ہے، لیکن شائقین کی سہولت اور عام اشاعت کے خیال سے علاوہ محصول ڈاک کل آٹھ روپیہ قیمت رکھی گئی ہے،

علم دوست ایک شائق کے پاس نظامی گنجوی کی مثنوی "شیرین خسرو" کا ایک قدیم قلمی نسخہ اچھی حالت میں ہے، صفحات کی تعداد دو سو ستر اور جدول مطلا ہے، وہ اسے الگ کرنا چاہتے ہیں، جو صاحب ذوق اس کو خریدنا چاہیں وہ جناب حامد حسن صاحب ایم اے قیصر منزل رامپور روڈ دہرہ دون سے خط و کتابت کریں،

مقالات

تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۵)

ملوکیت کے بعد کلام مجید کے نزول اس کی ترتیب و تدوین کی تاریخ اور تفسیر قرآن کی بحث ہے، اول الذکر خالص تاریخی ہے، اس لئے مصنف کو اس میں اپنے ذاتی خیالات کی آمیزش اور تدلیس کا بہت کم موقع ملا ہے، اور ایک دو معمولی فروگذاشتوں کے علاوہ باقی ان کے بیانات صحیح ہیں، لیکن تفسیر کی بحث میں انھوں نے حسب معمول صحیح اور غلط واقعات کو اس طرح خلط ملط کردیا ہے، اور ان سے ایسے غلط نتائج نکالے ہیں، کہ اس سے تفسیروں کا اعتبار اٹھ جاتا ہے، اس بحث میں انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے، کہ صحابہ کرام نے تفسیر قرآن کی جانب زیادہ اعتنا نہیں کیا، سب سے اول تابعین نے تفسیر لکھنے کی طرف توجہ کی، لیکن اس دور میں پورے قرآن کی تفسیر نہیں لکھی گئی، اس کا آغاز چوتھی صدی سے ہوا، اس دور میں بیرونی اثرات کی وجہ سے بہت سے غیر قوموں کے خیالات اور ان کی دوراز کار روایات تفسیروں میں شامل ہوگئیں چنانچہ لکھتے ہیں:-

"قرآن کریم کا زیادہ حصہ آیات محکمات پر مشتمل تھا جن میں اوامر و نواہی و فرائض کے احکام وغیرہ ہوتے تھے، جن پر مسلمان اسی وقت عمل شروع کر دیتے تھے..... جو آیات متشابہات نازل ہوتی تھیں..... ان پر عوام

کو بحث و مباحثہ کی ممانعت کر دی گئی تھی، لیکن ساتھ ہی قرآن کریم کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس پر تدبر و فکر کی دعوت بار بار دی گئی ہے، اور جس کے سمجھنے کی انسان کو ضرورت ہے،.... معمولی انسان اوامر و فرائض سے متعلق آیات کو فوراً سمجھ لیتے تھے، لیکن بہت سے مضامین ایسے ہوتے تھے، جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھے، اسی لئے جب صحابہ کرام کو کسی آیت کے صحیح مطلب سمجھنے مین دقت ہوتی، تو وہ خود رسول کریم کی خدمت میں حاضر ہو کر سمجھ لیتے تھے،.... اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی آیات الٰہی کی ضروری تشریح صحابہ کرام کے سامنے کر دیا کرتے تھے"

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مین نہ کسی نے تفسیر لکھنے کی کوشش کی، نہ تفسیر کے متعلق زیادہ روایات ہین،.... وہ تمام تفسیری روایتین جو صحابہ کرام کے ذریعہ رسول سے آئین، کل بیس صفحات پر مشتمل ہین (ص ۱۴۳)

"خلفائے راشدین، حضرت عبد اللہ بن مسعود، ابی بن کعب اور زید بن ثابت نے بہت سی آیات قرآنی کی تفسیرین روایت کین، لیکن پہلی صدی کے اخیر تک کوئی تفسیر کتابی شکل مین نہین لکھی گئی" (ص ۱۴۳)

"عہد صحابہ کے بعد تابعین کا دور آیا، اس وقت سب سے پہلے تفسیر لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اور مسلمانون کو اس طرف توجہ ہوئی اور انھون نے احادیث رسول اور تفسیرون کو لکھنے کا ارادہ کیا" (ص ۱۴۴)

"سب سے پہلی تفسیر مجاہد بن جبیر المتوفی ۱۰۳ھ نے لکھی، تاریخ القرآن مین سعید بن جبیر کو پہلا مفسر قرآن بتایا گیا ہے، لیکن ابن خلکان کے بیان کے مطابق سب سے پہلی تفسیر اسلام مین ابن جریج نے لکھی، یہ ۸۰ھ مین ایمان لائے، اور ۱۵۰ھ میں وفات پائی، اس زمانہ مین ان کے علاوہ عطا ابن دینار المتوفی ۱۲۶ھ، مقاتل بن سلیمان المتوفی ۱۵۰ھ، سفیان ثوری المتوفی ۱۶۱ھ اور دیگر چند علماء نے تفاسیر مین کتب کی تصنیف کا آغاز کیا، لیکن تیسری صدی کے آخر تک پورے قرآن کی

تفسیر کا ثبوت نہیں ملتا، ہارون رشید کے زمانہ مین جب جعفر برمکی نے کاغذ کو رائج کیا، تو کتابت کا شوق بڑھا، اس زمانہ مین پورے قرآن کی تفسیرین بھی لکھی گئین، (ص ۱۴۴)

"اسلام کے دور اول یعنی خلافت راشدہ کے ختم ہونے تک رومی اور عجمی عقائد کی زہریلی ہوائین اس کے مضبوط حصار مین داخل نہ ہونے پائی تھین،.... لیکن جب خلافت کو سلطنت کا جامہ پہنا دیا گیا، اور خلفاء کے بجائے ملوک و سلاطین مسلط ہوئے، جنھون نے حکومت کو اپنے خاندان مین محفوظ رکھنے کے لئے خود قرآن کریم کے مستقر اول یعنی مکہ اور مدینہ دونون بلاد امنا کو میدان کارزار و فتنہ و فساد بنا ڈالا، اور اسلام اپنے وطن سے بیگانہ سا ہو گیا تو رومی اور عجمی عقائد کی طوفان خیز ہواؤن کو کون روک سکتا تھا، جب چمن کا باغبان غافل ہو تو گلچین کے دست برد سے اس کو کون محفوظ رکھ سکتا ہے... جب عرب کے یہود و نصاریٰ اور ایران کے مجوسیون نے اسلام مین داخل ہونا شروع کیا تو یہ سب اپنے آبا و اجداد کے مذہبی تخیلات قدیم و پارینہ روایات اپنے ساتھ لے کر آئے، ادھر کوئی طاقت ان کو روکنے یا اصلاح کرنے والی نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان قصص و روایات اور اسرائیلیات و خرافات کا ایک بے پناہ سیلاب اسلام مین داخل ہو گیا، اور اس کے سیدھے سادے اور فطری اصول و عقائد کے صاف و شفاف چشمون کو اپنے ساتھ لائی ہوئی گندگیون مین آلودہ کر دیا، (ص ۱۴۶)

"تکوین عالم، تخلیق آدم اور گذشتہ انبیا کے واقعات و قصص جب مسلمانون کے سامنے قرآن مجید مین آئے تو انھون نے ان کو یہودی علماء سے دریافت کرنا شروع کر دیا، کیونکہ ان تمام چیزون کا ذکر ان کی کتابون مین آچکا تھا، (صفحہ ۱۴۷)

مصنف کا یہ بیان اگرچہ انفرادی واقعات کی حیثیت سے ایک حد تک صحیح ہے لیکن اغلاط سے پاک نہین، اور ان واقعات کا صرف ایک ہی رُخ دکھایا گیا ہے، خصوصاً جس نہج اور ترتیب سے اس کو پیش کیا گیا ہے، اور اس سے جو نتائج نکلتے ہین، وہ سراسر غلط ہین، اس بیان کے پڑھنے سے یہ اثر پڑتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ مین

تفسیر قرآن کا زیادہ اہتمام نہ تھا، کلام اللہ کا بڑا حصہ صحابہ خود سمجھ لیتے تھے جو نہ سمجھ سکتے تھے، اس کو آنحضرت صلعم سے پوچھ لیا کرتے تھے، یا آپ خود اس کی تشریح فرمادیا کرتے تھے، اسی لئے نہ صحابہ سے تفسیر کی زیادہ روایتیں ہیں اور نہ اونھون نے تفسیر لکھنے کی طرف توجہ کی، سب سے اول تابعین کو ادھر توجہ ہوئی، لیکن اونھون نے پورے قرآن کی تفسیر نہیں لکھی، اس کا آغاز چوتھی صدی میں ہوا، اس وقت یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے خیالات و روایات مسلمانون مین پھیل چکے تھے، جو تفسیرون مین داخل ہوگئے تھے، اسلئے یہ تفسیرین لائق اعتماد نہیں،

ان مین سے ایک نتیجہ بھی صحیح نہیں، مصنف کو اتنا تو تسلیم ہی ہوگا، کہ قرآن مجید ہی اسلام کی بنیاد اور مسلمانون کی دینی اور دنیوی صلاح و فلاح کا واحد صحیفہ ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کی تبلیغ کے لئے مبعوث ہوئے تھے، اس لئے آپ کا سب سے مقدم فرض اس کی وضاحت و تشریح اور مسلمانون مین اسکی تعلیم کی اشاعت تھا اس لئے اس کی تعلیم کی اہمیت اس سے کہین زیادہ ہے، جتنی مصنف کے بیان سے ظاہر ہوتی ہے، کہ صحابہ خود قرآن کو سمجھ لیتے تھے، اور جہان کوئی مشکل پیش آتی تھی، اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیتے تھے، یا آپ خود اس کی تشریح فرمادیتے تھے، اور اسی پر قرآن کی تعلیم و تشریح ختم ہوجاتی تھی، اس کے برخلاف عہد نبوی، عہد صحابہ، عہد تابعین ہر دور مین کلام مجید کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا، جن صحابہ مین تعلیم و تعلم کی صلاحیت تھی، انکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس خصوصیت کے ساتھ قرآن کی تعلیم دیتے تھے، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور بعض دوسرے صحابہ کو آپ نے خاص طور سے خود قرآن کی تعلیم دی تھی، حضرت ابی بن کعبؓ نے پورے قرآن کی تعلیم خود زبان مبارک سے پائی تھی[1]، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آپ سے ستر سورتین سیکھی تھین[2]،

حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے بھی قرآن کی تعلیم براہ راست زبان وحی والہام سے حاصل کی تھی، گو عہد نبوی مین حضرت ابن عباسؓ کم سن اور حضرت ابن عمرؓ نوجوان تھے، لیکن ان دونون مین فہم قرآن کی فطری صلاحیت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباسؓ

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۱۱۳ [2] بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۴۸،

کے لئے دعا فرمائی تھی کہ خدایا ان کو دین مین سمجھ اور تاویل قرآن کا علم عطا فرما[1]، اس دعائے مستجاب کے اثر اور اپنے شوق و محنت سے وہ جماعت صحابہ مین قرآن کے اتنے بڑے عالم بن گئے تھے، کہ ترجمان القرآن لقب ملا تھا، عبداللہؓ بن عمرؓ مین فہم قرآن کا ایسا ملکہ تھا کہ گو وہ نوجوان تھے لیکن اکابر صحابہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی مجلسون مین شریک ہوتے تھے، اور اس مجمع مین انکے فہم قرآن کے جوہر نمایان نظر آتے تھے[2]،

اس انفرادی طریقہ تعلیم کے علاوہ تعلیم قرآن کے اجتماعی حلقے بھی تھے جن مین صحابہ کرام باہم مذاکرہ کرتے تھے، ان مین کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوتے تھے، صفہ کی درسگاہ مین دو حلقے تھے، ایک اصحاب ذکر و فکر کا، دوسرا قرار کا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لاتے، تو قرار کے حلقہ مین بیٹھتے، اور فرماتے کہ مین معلم بنا کر بھیجا گیا ہون[3]، اس درسگاہ مین حافظ قرآن صحابہ تعلیم دیتے تھے، جن مین ایک حضرت عبادہ بن صامتؓ تھے[4] جن لوگون کو کاروبار کی مشغولیت کی وجہ سے دن کو تعلیم کا موقع نہ ملتا تھا، ان کے لئے رات کی تعلیم کا انتظام تھا، چنانچہ بعض اصحاب صفہ رات کو قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے[5]،

جو جدید الاسلام اشخاص اور قبائل مدینہ سے دور رہتے تھے، اور ان کو مدینہ آنے کا کم موقع ملتا تھا، انکی تعلیم انصار کے سپرد تھی، وفد عبدالقیس کا بیان ہے، کہ انصار ہم کو ہمارے رب کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت کی تعلیم دیتے تھے[6]، اس قسم کے جدید الاسلام قبائل کی تعلیم کے اور بہت سے واقعات حدیث و سیرت کی کتابون مین مذکور ہین،

جو اشخاص یا قبائل کسی معذوری کی بنا پر مدینہ نہین آسکتے تھے یا بقدر ضرورت یہان قیام نہین کرسکتے تھے، ان کی تعلیم کبھی وہان کے مسلمان عمال کے سپرد کردیجاتی تھی، اور کبھی مستقل معلم بھیجے جاتے تھے، چنانچہ یمن کے مسلمانون کی قرآن اور شرائع اسلام کی تعلیم حضرت معاذ بن جبلؓ کے متعلق تھی، جو وہان کے قاضی تھے[7]، ہجرت سے

[1] مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۵۳۴ [2] بخاری کتاب التفسیر سورۂ ابراہیم و کتاب العلم باب الفہم [3] ابو داؤد فضل العلما والحث علی العلم [4] مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۳۲۴ [5] ایضاً [6] اسد الغابہ ج ۴ ص ۳ [7] استیعاب تذکرہ معاذ بن جبلؓ

پہلے جب مدینہ کے چند انصاری گھرانوں نے اسلام قبول کیا، تو اون کی تعلیم قرآن کے لئے حضرت مصعب بن عمیرؓ اور ابن ام مکتومؓ بھیجے گئے،[1] تعلیم قرآن سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے، کہ وہ محض ناظرہ اور حفظ قرآن تک محدود تھی، بلکہ حسب ضرورت قراۃ اور قرآن کی تفسیر و تشریح ہر طرح کی تعلیم ہوتی تھی، بعض لوگ محض قراۃ یا احکام کی آیات سیکھتے تھے، بعض پوری تکمیل کرتے تھے، حضرت ابی بن کعبؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہم کو دس آیتیں پڑھاتے تھے، تو اس وقت تک ہم آگے نہ بڑھتے تھے جب تک ان پر عمل نہ سیکھ لیتے تھے،[2] ابن عباسؓ کی ایک اور روایت ہے کہ جب ہم میں سے کوئی شخص دس آیتیں سیکھ لیتا تھا، تو اس وقت تک آگے نہ بڑھتا تھا جب تک ان کے معنی اور ان پر عمل نہ سیکھ لیتا تھا،[3]

تابعین کے زمانہ میں بھی تعلیم کا یہی انداز تھا، ابو عبد الرحمن سلمی تابعی کا بیان ہے کہ جب ہم قرآن کی دس آیتیں سیکھ لیتے تھے، تو اس وقت تک آگے نہ بڑھتے تھے جب تک ان کے حلال و حرام اور امر و نہی سے پوری طرح واقف نہ ہو جاتے،[4]

مشہور مفسر تابعی مجاہد بن جبیر نے ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے کامل تیس مرتبہ قرآن کا دورہ کیا تھا، اور اس محنت کے ساتھ کہ ہر سورۃ کے جملہ متعلقات کی پوری تحقیق کرتے جاتے تھے،[5]

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اپنے محبوب غلام اور نامور تابعی عالم عکرمہ کو اس توجہ اور انہماک سے تعلیم دی تھی کہ اپنا سارا علم ان کے سینہ میں منتقل کر دیا تھا، ان کے فیض سے عکرمہ جماعتِ تابعین میں بڑے نامور عالم ہوئے، خصوصاً تفسیر میں ابن عباسؓ کے تمام تلامذہ میں وہ ممتاز تھے،[6]

حفاظ قرآن صحابہ خصوصاً حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے فیض سے تابعین میں بڑے بڑے مفسر پیدا ہوئے ان میں سعید بن جبیر، ضحاک بن مزاحم، عطا بن رباح، حسن بصری اور محمد بن کعب قرظی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں

[1] بخاری کتاب التفسیر [2] تفسیر قرطبی ج اول ص ۳۲ [3] ابن جریر ج اول ص ۲۹ [4] تفسیر قرطبی ج اول ص ۳۲
[5] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۳ [6] ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۲ و تہذیب التہذیب ج، ص ۲۶۵،

ان میں سے ہر ایک امام تفسیر تھا، سعید بن جبیر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے شاگرد رشید تھے، قرأت اور تفسیر دونوں کی تعلیم انہی سے حاصل کی تھی، اور جماعتِ مفسرین میں امام وقت شمار ہوتے تھے،[1] عطا بن رباح نے ابن عباسؓ کے علاوہ اور بزرگوں سے بھی استفادہ کیا تھا، یہ بھی جلیل القدر عالم اور مفسر قرآن تھے، تفسیر کا درس بھی دیتے تھے،[2] حضرت حسن بصری علم باطن کے ساتھ علم ظاہر کے بھی جلیل القدر عالم تھے، تفسیر میں خاص ملکہ تھا، اور اس کا درس بھی دیتے تھے،[3] محمد بن کعب قرظی بھی نامور عالم قرآن تھے،[4] یہ تو صحابۂ کرام اور تابعین کے انفرادی حلقہائے درس کا حال تھا، حکومت کی جانب سے علحدہ قرآن کی تعلیم کا نہایت مکمل انتظام تھا، حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ ممالک میں قرآن کے مدارس قائم کئے، اور قرآ صحابہ کو ان میں تعلیم کے لئے بھیجا، حضرت عبادہ بن صامت، معاذ بن جبل اور ابو درداء انصاریؓ کو شام بھیجا، حضرت عبادہؓ نے حمص میں قیام کیا، ابو درداءؓ نے دمشق کو مستقر بنایا، معاذ بن جبل نے فلسطین میں اقامت اختیار کی، پھر عبادہؓ بھی اسی ارض مقدس میں چلے آئے،[5] عمران بن حصین قرآن اور فقہ کی تعلیم کے لئے بصرہ بھیجے گئے،[6] ایک قاری ابو سفیان کو بدوؤں کی تعلیم کے لئے مقرر کیا، وہ قبائل کا دورہ کرکے ہر شخص کا امتحان لیتے تھے، جس کو قرآن یاد نہ ہوتا تھا اس کو سزا دیتے تھے،[7] سورۂ بقر، مائدہ، حج اور نور کا جن میں احکام و فرائض ہیں، ہر شخص کے لئے سیکھنا ضروری قرار دیا،[8] اس سے ظاہر ہے کہ اس میں تفسیر بھی شامل تھی قرآن کے معنی اور مفہوم کو صحیح سمجھنے کے لئے لغت اور کلام عرب کی تعلیم کی ہدایت کی، غیر عالم لغت کو قرآن کی تعلیم دینے کی ممانعت کر دی،[9]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے لیکر تابعین کے زمانہ تک کے تعلیم قرآن کے نظام کا یہ سرسری خاکہ ہے، اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان زمانوں میں قرآن کی تعلیم کی کتنی اہمیت تھی اور اس کا کتنا اہتمام تھا،

[1] ابن خلکان ج اول ص ۲۰۴ و ۲۰۵ [2] ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴ [3] شذرات الذہب ج اول ص ۱۳۶ و تہذیب تذکرہ جابر بن زید [4] تہذیب جلد ۹ ص ۴۲۱ [5] اسد الغابہ تذکرہ عبادہ بن صامت [6] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۵
[7] اصابہ تذکرہ اوقل بن خالد [8] کنز العمال ج اول ص ۲۲۴ [9] کنز العمال،

مصنف کے بیان کے مطابق محض اسی پر بس نہیں تھا، کہ احکام و فرائض و محکمات خود صحابہ سمجھ لیتے تھے، اور جب کسی صحابی کو کسی آیت کا صحیح مطلب سمجھنے میں دقت ہوتی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیتے یا آپ خود ضروری تشریح فرما دیتے" اگر مصنف کا بیان صرف اسی حد تک ہوتا تو بھی ہم کو اس کے ماننے میں تامل نہ ہوتا، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس دور میں تعلیم و تفسیر قرآن کا اہتمام نہ تھا،" اسی لئے حیات نبوی میں نہ کسی نے تفسیر لکھنے کی کوشش کی، اور نہ تفسیر کے متعلق صحابہ کی زیادہ روایات ہیں، بلکہ ان کی پوری تعداد بیس سے زیادہ نہیں بڑھتی" کس قدر غلط ہے،

بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی، لیکن اس بنا پر نہیں کہ اس کی کوئی اہمیت نہ تھی، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تفسیر لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، صاحب وحی و الہام ان کے درمیان خود موجود تھے، پھر عہد صحابہ میں اکابر صحابہ خود عالم قرآن تھے، اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی، کہ اس زمانہ میں کسی علم و فن کو قلمبند کرنے کا رواج ہی نہ تھا، اور اس کا خزانہ علماء کا سینہ ہوتا تھا، عرب جاہلی کا سارا کلام محض سینوں میں محفوظ تھا، تعلیم و اشاعت کا طریقہ زبانی درس و روایت تھا، بنی امیہ کے زمانہ تک یہی طریقہ رائج رہا،

اگرچہ تاریخوں میں اس عہد کی بعض تالیفات کا ذکر ہے، لیکن وہ نہ ہونے کے برابر ہیں، تصنیف و تالیف کا باقاعدہ آغاز عباسی دور سے ہوا، لیکن تحریری یادداشتوں کا طریقہ عہد نبوی میں بھی تھا، چنانچہ متعدد صحابہ حدیث کے متعلق یادداشتیں قلمبند کرتے تھے، حضرت ابی ابن کعبؓ کی تو ایک تفسیری کتاب کا بھی ثبوت ملتا ہے، شیخ محمد خضری لکھتے ہیں، کہ ابی بن کعبؓ کا ایک بڑا تفسیری نسخہ موجود تھا جس سے ابن جریر، ابن ابی حاتم، احمد بن حنبل اور حاکم نے اپنی کتابوں میں فائدہ اٹھایا ہے[1] تابعین میں مجاہد بن جبیر اور سعید بن جبیر تبع تابعین میں ابن جریج کے متعلق خود مصنف کو اعتراف ہے، کہ انھوں نے تفسیریں لکھیں، گو وہ ان کے نزدیک پورے قرآن کی تفسیر نہ تھیں تاہم اس سے کم از کم اتنا ثابت ہے، کہ گو اس زمانہ میں تفسیر پر موجودہ اصطلاح کے لحاظ سے مستقل کتابیں نہ لکھی گئی تھیں

---

[1] مبادی التفسیر ص ۱۱

لیکن ان کے متعلق تحریری سرمایہ فراہم ہو گیا تھا، مصنف کا یہ بیان کس درجہ مضحکہ خیز ہے کہ صحابہ سے تفسیری روایتیں بہت کم مروی ہیں، اور ان کی تعداد بیس صفحوں سے زیادہ نہیں" لطف یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ اعتراف بھی ہے کہ "خلفائے راشدین، حضرت عبد اللہ بن مسعود، ابی بن کعب اور زید بن ثابت نے بہت سی آیات قرآنی کی تفسیریں روایت کیں" کیا سات صحابہ کرام کی بہت سی تفسیری روایات مل کر بھی بیس صفحوں سے زیادہ نہ ہوں گی، اگر تنہا ابن عباسؓ ہی کی روایات لے لی جائیں تو بھی ایک پوری کتاب تیار ہو جائے، مصنف نے ایک موقع پر ابن جریر کی بڑی تعریف کی ہے، لکھتے ہیں:۔

> "ابن جریر کی تفسیر کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس کو امام التفسیر کہا جاتا ہے، اور بعض علماء کا قول اس تفسیر کے متعلق یہ ہے کہ اگر کسی نے چین تک کا سفر تفسیر طبری (ابن جریر) کو حاصل کرنے کے لئے کیا تو بھی کوئی زحمت نہیں اٹھائی، اس تفسیر میں سب سے پہلے ذہنی کاوش اور دماغی کوشش سے کام لیا گیا ہے اور اس وقت تک جتنے علوم قرآن کی تفسیر کے متعلق جمع ہو چکے تھے، اس میں ان سب کو جمع کر دیا گیا ہے، اور ساتھ ہی ہر روایت کی سند بھی دے دی گئی ہے"۔

یہ کتاب تیس جلدوں میں ہے، اور اس میں تمام تر روایات ہی روایات ہیں لیکن ان روایات میں صحابہ کرام کی مستند روایات کا بھی معتد بہ حصہ ہے، اس کے بعد یہ کہنا کہ صحابہ کرام کی روایات بیس صفحوں سے زیادہ نہیں کس درجہ حیرت انگیز ہے،

مصنف کا یہ بیان تشریح طلب ہے کہ "تابعین نے پورے قرآن کی تفسیر نہیں لکھی" اگر اس سے ان کی یہ مراد ہے کہ موجودہ کتابوں کے طرز پر پورے قرآن کی مرتب تفسیر نہیں لکھی، تو یہ صحیح ہے، اور اس کی وجہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا، کہ اس زمانہ میں کتابوں کے لکھنے کا طریقہ نہ تھا، اور اگر یہ مراد ہے کہ قرآنی مشکلات کا حل باقی رہ گیا جس کو بعد کے مفسرین نے اپنی ذہانت سے گڑھا، تو یہ غلط ہے، تمام مشکلات قرآنی کا حل خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول اور صحابہ کرام سے مروی ہے، جو حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں محفوظ ہے، یہ اور بات ہے کہ بعد کے علماء

مصنفین نے اپنے علم و نظر اور اپنے اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق اس مین اور اضافے کئے، صرف ابن جریر کی روایات اس کے ثبوت کے لئے کافی ہین، کہ عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ مین کلام مجید کی کسی حل طلب آیۃ کی تشریح باقی نہ رہ گئی تھی، اگر وہ بعد مین کتابی صورت مین مدوّن ہوئی، اس لئے تفسیرون کے بعد مین مدوّن ہونے سے کلام مجید کی صحتِ تفسیر پر اثر نہین پڑ سکتا،

یہ بھی واضح رہے کہ کلام مجید کی ہر آیۃ کی تفسیر تو کسی بڑی سے بڑی تفسیر مین بھی نہین، بہت سی آیات اتنی ظاہر و واضح ہین، کہ ان کی تفسیر کی ضرورت ہی نہ تھی، بعض اہم مشکلات کی متفقاً تمام مفسرین نے تفسیر کی ہے، بعض ایسی ہین، جن کی تفسیر بعض مفسرین کے نزدیک ضروری تھی، بعض کے نزدیک غیر ضروری، اس کی مثال بلا تشبیہ دنیاوی کتابون کی شرح سے دیجا سکتی ہے کہ ایک کتاب کی مختلف شرحین لکھی جاتی ہین، جامعیت کے اعتبار سے ممکن ہے ایک شرح دوسری سے بہتر ہو، لیکن پوری کتاب کی شرحین سب کہلائین گی، اس لئے دیکھنا صرف یہ چاہئے کہ مجموعی حیثیت سے تمام حل طلب آیات کی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کی زبانی منقول ہے یا نہیں، اگر ہے تو پورے قرآن کی تفسیر کے لئے اتنا کافی ہے، یہ ضروری نہیں کہ مرتب طریقہ سے کسی ایک کتاب مین مدوّن یا کسی ایک صحابی یا ایک تابعی سے منقول ہو، یہ واضح رہے کہ صحابہ کی جن تفسیری روایات مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع کی تصریح نہیں ہے، وہ بھی درحقیقت آپ ہی سے سُنی ہوئی ہین، یا کم از کم صحابۂ کرام کے فہم قرآن کا نتیجہ ہین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیم کا فیض ہے،

یہ انکشاف بالکل نیا ہے، کہ ہارون رشید کے زمانہ مین جب جعفر نے کاغذ کو رائج کیا، اس وقت کتابت کا شوق بڑھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے کاغذ رائج نہ ہوا تھا، ممکن ہے آغازِ اسلام مین عرب مین اسکا استعمال نہ ہوتا ہو، لیکن عہدِ نبوی کے آخر مین تو رائج ہو چکا تھا، بخاری کی حدیثِ قرطاس تو بہت مشہور ہے، مصنف کو یہ تو سوچنا چاہئے تھا، کہ خلفاے راشدین اور بنی امیہ کے زمانہ مین اتنی بڑی سلطنت کا دفتری کاروبار کیا صرف اونٹ کی ہڈیون اور کھجور کے پتون سے چلتا تھا، حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ مین باقاعدہ رجسٹر تیار ہو گئے تھے، لیکن مصنف کو

عقل و درایت سے کیا سروکار انھین تو محض اعتراض چاہئے، خواہ وہ کتنا ہی بے سر و پا کیون نہ ہو،

یہ تسلیم ہے کہ ملوک و سلاطین کے زمانہ مین اسلام کے حصار مین رومی و عجمی عقائد کی طوفان خیز آندھیان آئین اس سے بھی انکار نہین کہ عرب کے یہود و نصاری اور ایران کے مجوسی اپنے آبا و اجداد کے مذہبی تخیلات اور پارینہ روایات اپنے ساتھ لائے، اور ان کے قصص و روایات و اسرائیلیات و خرافات کا بے پناہ سیلاب اسلام مین داخل ہو گیا، لیکن یہ غلط ہے کہ اس کا سبب ملوکیت تھی، اور اس کا کوئی روکنے والا نہ تھا، اور ان بیرونی اثرات کی آمیزش کی وجہ سے حدیث و تفسیر کا سارا دفتر بے کار ہو گیا، ملوکیت کو اس سے کوئی تعلق نہین، بلکہ جیسا کہ ہم نے کسی مقام پر کہا ہے، یہ مختلف قومون اور مذہبون کے باہمی اختلاط کا فطری نتیجہ تھا، جس کے ابتدائی اثرات خلافتِ راشدہ ہی کے زمانہ سے شروع ہو گئے تھے، لیکن اس کا پورا ظہور اموی اور عباسی عہد مین ہوا، جس کو حکومت اور اسلام کے اصلی محافظین یعنی صحابہ، تابعین اور علماء و محدثین نے روکنے کی پوری کوشش کی،

مصنف کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام نے اپنی اور مسلمانون کی حفاظت کی ذمہ داری تنہا حکومت پر کبھی نہین رکھی ہے، بلکہ یہ فرض علی قدر مراتب تمام مسلمانون پر عائد کیا ہے، اور اس کے سب سے بڑے ذمہ دار حاملین قرآن و حدیث ہین، اور الحمد للہ کہ مسلمانون مین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والی جماعت ہر دور مین موجود رہی ہے، خود خلفاے راشدین کے زمانہ مین بھی جنھون نے اسلام کی حفاظت کا پورا حق ادا کیا، یہ جماعت اپنے فریضہ سے غافل نہ رہی اور حکومت سے الگ صحابہ خود اپنے طور پر بھی اس فرض کو انجام دیتے رہے، خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کے دور مین بھی جب اموی اور عباسی سلاطین نے بعض امور مین غفلت اور مسامحت سے کام لیا، تو اسلام لاوارث نہین ہو گیا تھا بلکہ یہ جماعت برابر اپنا فرض انجام دیتی رہی، درحقیقت اسلام کے اصلی محافظ یہی لوگ تھے، جو ہر زمانہ مین موجود اور اپنے فرض کو ہمیشہ انجام دیتے رہے، حتی کہ حکومت کے مقابلہ مین بھی ان کی حق گو زبانین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے خاموش نہ رہین، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اس لئے بعض امور مین گو ملوک و سلاطین نے غفلت ضرور کی، لیکن اس کی وجہ سے اسلام کی حفاظت

مین فرق نہین آنے پایا،

اس سے انکار نہین کہ تفسیرون بلکہ حدیثون تک مین اسرائیلی روایات داخل ہوگئین، لیکن اس زہر کا تریاق بھی مہیا ہوتا رہا، اور ہر دور کے محدثین اس آمیزش کو برابر چھانٹتے رہے، اسی کی پرکھ کے لئے رجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا، جس مین ہزارون رواۃ حدیث کے صحیح حالات مندرج ہین، فن روایت و درایت کے اصول بنائے، موضوعات پر کتابین لکھین، غرض کلام ہی کو دوسرے کلام کی آمیزش سے پاک رکھنے کے لئے طاقت بشری مین جتنی کوششین اختیار طین ممکن تھیں صرف کر دین، اور ایک ایک باطل حدیث کو چھانٹ کر الگ کر دیا، احادیث و تفسیر پر جن لوگون کی نظر ہے، وہ ایک نگاہ مین اسرائیلیات کو پہچان سکتے ہین، بلکہ اسرائیلیات کا موضوع اور اس کا دائرہ تو اتنا معلوم اور متعین ہے، کہ جس کو تھوڑا سا بھی اسلامی علوم مین درک ہے، وہ بیک نظر ان کو پہچان لے گا، پھر یہ کہ ان اسرائیلیات کا تعلق اسلام کے ارکان و عقائد سے مطلق نہین ہے، بلکہ وہ صرف گذشتہ انبیاء و رسل اور ان کی امتون یا دنیا کی قدیم تاریخ ترغیب و ترہیب یا دوسرے قصص و حکایات پر مشتمل ہین، اور ان مین کسی چیز کو بھی اسلامی ارکان و عقائد سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، اس لئے اسرائیلیات کی آمیزش سے اسلام کی حقیقی تعلیمات پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لیکن اگر بالفرض اسے مان بھی لیا جائے کہ اصلی تعلیمات مین بھی اسرائیلیات داخل ہوگئین تو ان کو الگ کرنے کی تدبیرین اور صورتین اختیار کیجائین گی، یا ان کی وجہ سے مذہب کا پورا دفتر بے کار کر دیا جائے گا، اور اسرائیلیات کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثین اور روایتین بھی مسترد کر دیجائین گی، سچ مین جھوٹ کی آمیزش تو زندگی کے روزانہ کے واقعات مین ناگزیر چیز ہے جس سے کسی حالت مین مفر ممکن نہیں، مقدمات مین جھوٹ کی آمیزش تو روزانہ کا مشاہدہ ہے لیکن کیا اس آمیزش کی وجہ سے سچائی کی تحقیق کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، اور ایک حاکم محض جھوٹ کی آمیزش کی وجہ سے سچی شہادتون اور سچے واقعات کو بھی مسترد کر دیتا ہے، اور سچائی کی تلاش و تحقیق سے بھی دست بردار ہو جاتا ہے جھوٹی روایات مین سچائی اور اصلیت کی تلاش و تحقیق تو اس کا فرض ہے، اگر جھوٹ کی وجہ سے سچ کو بھی ناقابل اعتبار قرار دیدیا جائے، اور سچائی کی تلاش چھوڑ دیجائے، تو زندگی کا سارا کاروبار ہی معطل ہو جائے، جب دنیاوی امور

مین جھوٹ کے خاطر سچ کو ترک نہین کیا جا سکتا، تو کیا محض اسرائیلیات یا جھوٹی روایات کی وجہ سے قول رسول کو مسترد کر دیا جائے گا،

اس کے بعد اسلامی عقائد اور تفسیرون مین ایرانی و یونانی خیالات و عقائد کی آمیزش کے سلسلہ مین ارشاد ہوتا ہے

"یہود و نصاریٰ کی خرافات سے بھی زیادہ جس چیز نے اسلامی عقائد کو متاثر کیا، وہ ایران و یونان کا فلسفہ قدیم تھا، جب ان ممالک کے علماء و حکما اسلام مین داخل ہونے لگے، تو ایران سے زردشت مزدک اور مانی کے خیالات اور یونان سے افلاطون، ارسطو اور دوسرے حکماء کی تعلیمات نے مفسرین اسلام کو اس قدر متاثر کیا، کہ انھون نے ان حکماء کے غیر الہامی اور انسانی دماغ کے بنائے ہوئے مسائل کو مسلمات سمجھکر اختیار کر لیا، اور تمام تفاسیر مین دور از کار بحثین اور غیر مفید الجھنین شامل ہوگئیں، مثلاً برق، رعد، سماء وغیرہ قرآن مجید مین خود اپنے مستقل معنی رکھتے تھے، مگر جب یونانی علم الاصنام کی اصطلاحات کا ترجمہ اس قسم کے الفاظ مین کیا گیا، تو وہی مطالب تفسیرون مین شامل کر لئے گئے جو طبیعیات یونانی مین مستعمل تھے، متکلمین نے اسلامی عقائد و خیالات کو ارسطو کی کسوٹی پر رکھ کر ان سے مطابقت دینے کو بڑی خدمت سمجھا یہی وجہ ہے کہ چوتھی صدی سے آج تک بے شمار تفسیرین اس قسم کی فلسفیانہ موشگافیون سے بھری پڑی ہین، انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے، کہ وہ اپنے وقت کے رجحانات کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے اور اپنے ماحول کا شکار ہو جاتا ہے ...... وقت کے غلط تخیلات سے اثر پذیر ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر تفسیرین مفسرین کے ذاتی رجحانات کا شکار ہوگئین، متکلمین نے اپنی تفاسیر مین منطق، فلسفہ اور خطابت کا تمام زور صرف کر دیا، جو صرف و نحو اور بلاغت مین ید طولیٰ رکھتے تھے، انھون نے فنی زاویۂ نظر سے بحثون کے دروازے کھول دیئے، جو علم تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے، انھون نے قصص و امثال ہی کو اصل قرآن سمجھ کر پوری قوت ان کی تشریحات مین صرف کر دی، جو فروعات فقہ مین ماہر تھے، ان کی تفاسیر مسائل فقہ پر مبنی ہین گی، پھر جب فقہ اور فلسفہ کی بنا پر مختلف مذہب قائم ہوگئے، تو ہر ایک مذہب نے اپنے اپنے عقائد

کے مطابق تفسیریں شروع کر دیں، معتزلہ اور اشعریہ نے ایک دوسرے کی ضد میں صفات و ذات الٰہی کی بحثوں میں بے شمار کتب تفسیر مدوّن کیں، تو صوفیہ نے عزلت نشینی تزکیۂ قلب اور جہاد بالنفس کا رنگ بھر دیا (ص ۱۴۹ و ۱۵۰)

لائق مصنف نے اس بیان میں مختلف النوع مسائل کو خلط ملط کر دیا ہے، اور تفسیر کی بحث میں کلام کے مسائل چھیڑ دیئے، ان مسائل پر آئندہ مستقل گفتگو ہو گی، اس لئے اس موقع پر ہم اس کی تفصیل میں نہیں پڑتے، مصنف کے اس بیان میں بھی چند در چند غلطیاں ہیں، یہ تسلیم ہے کہ یونانی فلسفہ نے بعض اسلامی عقائد کو متاثر کیا، اور اس کی بنا پر مسلمانوں میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے، لیکن ایران کا اثر محض تمدن و معاشرت تک محدود رہا، اسلامی عقائد پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا، کسی اسلامی عقیدہ میں زردشت، مزدک اور مانی کے خیالات کا اثر نہیں مل سکتا، فرق کی کتابوں میں بعض ایسے عجمی فرقوں کا حال ضرور ملتا ہے جنھوں نے زردشتی، مزدکی، مانوی اور اسلامی، عقائد کا ایک معجون مرکب تیار کیا، لیکن ان کو کسی زمانہ میں بھی مسلمان نہیں سمجھا گیا، اور نہ صرف محدثین بلکہ حکما تک نے انھیں مسلمان نہیں مانا، اور تفسیروں میں تو زردشتی، مزدکی یا مانوی اثرات کا کوئی خفیف پرتو بھی نہیں مل سکتا، یونانی فلسفہ کے اثرات بھی جن سے مسلمان زیادہ متاثر ہوئے محض ذات و صفات الٰہی کے چند مسائل تک محدود ہیں، تفسیروں سے ان کا بھی کوئی تعلق نہیں، بعض تفسیروں میں تردید اً ضرور یہ خیالات نقل کئے گئے ہیں، جس کو قبول اثر سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے، یہ مصنف کا محض زور بیان ہے، کہ "مفسرین نے یونانی حکما کے غیر الہامی خیالات کو مسلمات سمجھ اختیار کر لیا، اور تمام تفسیروں میں دور از کار بحثیں شامل کر دیں، اور چوتھی صدی سے آج تک بے شمار تفسیریں اس قسم کی فلسفیانہ موشگافیوں سے بھری پڑی ہیں" جو سراسر غلط ہے، نہ مفسرین نے ان خیالات کو کبھی قبول کیا، اور نہ تفسیروں میں ان کو جگہ دی بعض متکلمانہ تفسیروں میں تردید کے لئے البتہ یہ خیالات نقل کئے گئے ہیں، جن کو ان کے قبول سے تعبیر کرنا غلط ہے، کاش مصنف نے ان بے شمار تفسیروں میں چند ہی کا نام لے لیا ہوتا،

فلسفۂ یونان سے مسلمانوں اور اسلامی عقائد کے اثر پذیر ہونے کا جملہ جسے راقم الحروف نے بھی

جا بجا استعمال کیا ہے، تشریح طلب ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانوں کی ساری قوم اور ان کے تمام عقائد اس سے متاثر ہو گئے، بلکہ اہل علم کی ایک جماعت اور بعض عقائد پر اس کا اثر پڑا تھا، جو لوگ فلسفۂ یونان سے زیادہ متاثر ہوئے وہ حکما، کہلائے، مگر ان کو کسی زمانہ میں بھی مذہب کا ترجمان، اسلام کا نمایندہ، اور مسلمانوں کا رہنما نہیں سمجھا گیا، بلکہ وہ ہمیشہ اس مقدس دائرہ سے الگ رکھے گئے، اسلام کے اصلی ترجمان اور اس کے محافظ اور مسلمانوں کے ہادی و رہنما محدثینِ کرام تھے، جو ہمیشہ مسلمان حکما کے خیالات کی تردید اور اس سے تبری کرتے رہے، اور اسلام کے صاف و شفاف چشمے کو اس کی کدورتوں سے پاک رکھنے کی پوری کوشش کی، اکابر حکما میں کندی، فارابی، ابن سینا، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن ہیثم، ابن مسکویہ، کسی کو یہ منصب حاصل نہ ہوا، اور نہ ان میں سے کسی نے تفسیر لکھی، بلکہ قاضی ابن رشد تک کو جو جلیل القدر عالم دین بھی تھے محض فلسفہ کے داغ کی وجہ سے کبھی دین کی ترجمانی کا منصب نہ ملا،

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ اہل علم کی ایک جماعت فلسفۂ یونان سے متاثر تھی، اور اوس کے اثر سے مسلمانوں کے ایک طبقہ میں یہ خیالات پھیل رہے تھے، ٹھیک اسی طرح جس طرح آج مغربی علوم و فنون کے اثرات پھیل رہے ہیں، ایسی صورت میں علما، یا خاموش بیٹھے رہتے اور مسلمانوں کو ان ملحدانہ خیالات کا شکار ہونے دیتے، یا ان کی تشفی بخش تردید کرتے، عقلی علوم کی تردید کے لئے تنہا نقل کافی نہ تھی، اس لئے علما، کی ایک جماعت کو محض اسلامی عقائد کو یونانی علوم کے حملہ سے بچانے کے لئے اس میں حصہ لینا پڑا، اور چونکہ محض نقلی علوم سے ان کی تردید ممکن نہ تھی، اس لئے ان کو بھی فلسفہ اور عقلیات کے اسلحہ سنبھالنے پڑے جس سے علم کلام کی بنیاد پڑی، ان علما میں بہت سے صاحب بصیرت اور ارباب عزیمت متکلم اور فلسفی علما، نے فلسفۂ یونان پر تنقید کر کے اس کے نقائص دکھائے، اور ان کا رد کیا، مثلاً امام غزالی، امام رازی، ابو البرکات بغدادی، شیخ شہاب الدین مقتول اور ابن تیمیہ اور امام شہرستانی وغیرہ، جن علما، میں اتنی ہمت و بصیرت نہ تھی، انھوں نے اسلامی عقائد اور فلسفۂ یونان میں مطابقت دینے کی کوشش کی گو ان کا یہ طریقہ صحیح نہ تھا، لیکن ان کی نیت نیک تھی، اس کے باوجود چونکہ یہ طرز کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف تھا، اور اس مطابقت میں کہیں کہیں اسلامی تعلیمات میں تاویل سے کام لینا پڑتا، اور آیاتِ قرآنی کے ظاہری معنی سے

ہٹنا پڑتا تھا، اس لئے محدثین اور دیندار علما نے اس کو بھی خلافِ مذہب قرار دیا، اور ان کی تردید کی ابتداء سے ضرور بعض فلسفیانہ خیالات اسلامی عقائد میں آگئے، جن کو مصنف نے فلسفۂ یونان کے قبول سے تعبیر کیا ہے، ان خیالات کے قبول کرنے کا تو سوال الگ رہا، محدثین نے تو ان کے حملہ سے اسلامی عقائد کو بچانے کے لئے ایسے طریقہ دفاع تک کو گوارا نہ کیا، جس سے صاف و سادہ اسلامی عقائد میں کوئی ایسی خفیف تاویل بھی کرنی پڑے جس کی سند کتاب اللہ وسنتِ رسول میں موجود نہیں ہے، رہا یہ امر کہ یہ طریقۂ دفاع مفید ثابت ہوا یا مضر تو اس کے فائدہ میں کوئی شبہ نہیں، اس سے بعض اسلامی تعلیمات اور اسلامی عقائد کے بارہ میں اس زمانہ کے عقل پرستوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوگیا، لیکن اسی کے ساتھ مذہب میں بعض غیر ضروری مسائل پیدا ہوگئے، جن کو اسلام کے سادہ اور صاف عقائد سے کوئی علاقہ نہ تھا، لیکن متکلمین کے حُسن نیت میں کوئی شبہ نہیں، اللہ تعالیٰ ان کی نیتوں کا ان کو اجر دے گا، دین کے اصلی محافظوں کو تو بیشک ان پر اعتراض کا حق ہے، لیکن دورِ جدید کے مصلحین کو ہرگز اس کا حق نہیں پہنچتا، جو لوگ سر سید احمد خان، مولوی چراغ علی اور ان کے ہم مشربوں کی قرآنی تاویلات اور اسلامی تعلیمات کی غلط تعبیروں کو جو متکلمین اسلام کی غلطیوں سے کہیں زیادہ گمراہ کن ہیں، صحیح اور اس کو خدمت دین سمجھتے ہوں، انھیں متکلمین اسلام پر اعتراض کا کیا حق ہے،

مصنف کا یہ اعتراض کہ "ہر فن کے علما نے اپنے فن کی روشنی میں کتاب اللہ کی تفسیر کی، اور اکثر تفسیریں مفسرین کے ذاتی رجحانات کا شکار ہوگئیں" قرآن مجید سے ان کی ناواقفیت کا ثبوت ہے، یہ ان مفسروں اور ان کی تفسیروں کا عیب نہیں، بلکہ ان کا کمال و ہنر اور ان کی بہت بڑی دینی خدمت ہے، یہاں تک تو تسلیم ہے، کہ کلام مجید کو یونانی فلسفہ سے کوئی علاقہ نہیں، اور جن لوگوں نے اس کی روشنی میں اس کی تفسیر کی ہے، انھوں نے دین کی خدمت انجام نہیں دی، لیکن مصنف نے اور جن علوم کا نام لیا ہے مثلاً صرف و نحو، معانی و بیان، تاریخ، فقہ اور تصوف تو قرآن تو ان سب کا جامع ہے، اور اس کو ان سے نہایت گہرا تعلق ہے، قرآن عربی زبان میں ہے اور غیر عرب کے عربی زبان کے صحیح پڑھنے اور اس کے معنی سمجھنے کا دارومدار تمام تر صرف و نحو کے علم پر ہے، اس سے ناواقف

شخص نہ صرف یہ کہ عربی کے صحیح معنی نہیں سمجھ سکتا، بلکہ عبارت تک صحیح نہیں پڑھ سکتا، پھر اس میں جابجا صرفی و نحوی اشکالات ہیں، جن کے حل کے لئے صرف و نحو میں بصیرت کی ضرورت ہے، اس لئے کلام مجید کی صرفی اور نحوی تشریح اس کی خدمت ہوئی یا مخالفت، خود فاضل مصنف نے عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر کلام مجید کے سمجھنے میں جو جو غلطیاں کی ہیں، اس کی مثالیں آیندہ آئیں گی، کلام مجید میں گذشتہ انبیا و رسل اور ان کی امتوں اور قدیم اقوام کے سبق آموز تاریخی واقعات ہیں، اس لئے اگر کسی مورخ نے تاریخی پہلو سے اس پر نگاہ ڈالی تو کیا گناہ کیا، اسی طرح کلام مجید فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، بلکہ اوس نے فصحائے عرب کو اپنا جواب بنانے کی تحدی کی جس سے وہ عاجز رہے، اگر کسی نے کلام مجید کے اس دعوی کے ثبوت میں فصاحت و بلاغت کے پہلو سے آیاتِ قرآنی کی تشریح کی، تو اوس نے اوس کی خدمت کی یا اوس کو بگاڑا، کلام مجید میں، طہارت، عبادت، معاملات نماز روزہ حج زکوٰۃ نکاح و طلاق وراثت تجارت لین دین وغیرہ کے صدہا مسائل اور قوانین ہیں، بعض کلی مسائل سے جزئیات کا استنباط ہوتا ہے، اس لئے اگر کسی نے اس کے فقہی پہلو پر نگاہ ڈالی، اور اس سے مسائل استنباط کئے، تو اس نے دین کی خدمت کی یا اس کی مخالفت کی، اسی طریقہ سے کلام مجید کا اصل مقصد تزکیۂ روح و قلب اور تعلق مع اللہ ہے، اور جہاد نفس اس کا وسیلہ ہے، اس کے بغیر روح کا تزکیہ ممکن ہی نہیں ہے، اس لئے اگر کسی صاحبِ نظر اہلِ دل مفسر نے اس روح کو نمایاں کیا، تو اوس نے کلام مجید کے اصل منشا کو پورا کیا یا اوسے اپنے ذاتی رجحانات کا شکار بنایا، درحقیقت کلام مجید، فصاحت و بلاغت کا نمونہ بھی ہے، دنیاوی قانون کا ضابطہ بھی ہے، زندگی کا دستور العمل بھی ہے، تزکیۂ قلب و روح کا نسخہ بھی ہے، نجات اُخروی کا صحیفہ بھی ہے، غرض وہ ایک مسلمان کے لئے دین بھی ہے، دنیا بھی، وہ تو ایسی جامع الحیثیات کتاب ہے کہ اس کے محاسن کا احاطہ مشکل ہے،

دامانِ نگہ تنگ و گل حسنِ تو بسیار
گلچینِ جمالِ تو ز داماں گلہ دارد

اسلئے جن علماء نے ان مین سے کسی جہت کی تشریح و تفسیر کی، اونھون نے اس کے جمال رُخ کو نمایان کیا یا اوس کو بگاڑا، یہ تو مسلمانون کا نہایت پر فخر کارنامہ ہے، کہ اونھون نے اپنی مذہبی کتاب کے سیکڑون پہلوؤن پر کتابین لکھین، اور حتی الامکان اوس کا کوئی گوشہ تشنہ نہین چھوڑا، اور علوم قرآنی پر ایسا عظیم الشان ذخیرہ فراہم ہوگیا، جس کی مثال دنیا کی کوئی قوم نہین پیش کر سکتی، لائق مؤلف نے مسلمانون کے اس سارے کارنامے پر بہ یک جنبش قلم خط نسخ پھیر دیا،

(باقی)

کلیاتِ فارسی

مولانا شبلی مرحوم کے تمام فارسی قصائد، غزلیات، مثنویات اور قطعات کا مجموعہ جواب تک متفرق طور سے دیوانِ شبلی، دستۂ گل، بوے گل، برگِ گل کے نامون سے چھپے تھے، اس میں سب یکجا کر دیئے گئے ہین،

ضخامت ۲۴۴ صفحے قیمت :- عہ

خط و کتابت کیلئے

ضروری اطلاع

معارف کے مضامین اور علمی استفسارات اور ان کے متعلق جملہ خط و کتابت شخصی نام کے بجائے صرف اڈیٹر معارف کے پتہ سے، اور معارف اور دار المصنفین کے انتظامات اور فرمایشات کے متعلق منیجر صاحب دار المصنفین کے نام سے کیجائے، ان تمام امور کے متعلق میرے نام خط لکھنے سے تعمیل مین دقت ہوتی ہے، امید ہے کہ احباب مجھے زحمت سے بچانے کے لئے اس کا خاص طور سے خیال فرمائین گے،

سید سلیمان ندوی

ابن منظور افریقی

کی

لسان العرب پر ایک نظر

از جناب پروفیسر عبد القیوم صاحب ایم اے، لکچرار زمیندار کالج گجرات

جن جن ملکون مین اسلام کا پرچم لہرایا، اور جہان جہان عربون نے دینِ حنیف کا پھریرا اڑایا، وہان علم و عرفان کے چشمے ابل پڑے، جو ملک بھی اسلام کے زیر اثر آیا، عربی علم و ادب کا مرکز بن گیا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو عربی علوم و آداب کی تاریخ کے ایک طالب علم کی نگاہ سے پوشیدہ نہین رہ سکتی،

افریقہ بھی مسلمانون کے انہی مفتوحہ ممالک مین سے ہے، جہان عربون نے اپنی تہذیب و ثقافت کے اتنے گہرے نقوش چھوڑے ہین، کہ زمانہ کی دستبرد اب تک انھیں مٹا نہین سکی، اور باوجودیکہ افریقہ وحشت اور بربریت مین شہرۂ آفاق ہے، لیکن عربی زبان کی گرفت مین کچھ اس طرح آیا، کہ صدیان گذر جانے کے بعد بھی وہان اسلامی اثرات بڑے نمایان اور ابھرے ہوئے نظر آتے ہین، چند برس ہوئے ایک امریکن مسیحی مبلغ نے لکھا تھا:

"اسلام نے افریقہ کے لئے ایک مخصوص تعلیمی اسکیم تیار کر رکھی ہے، سینی گال مین جو فرانس کے ماتحت ہے، عربی زبان اسکولون مین پڑھائی جاتی ہے، اور اس قسم کے اٹھارہ سو ابتدائی مدارس موجود ہین، ان مدارس مین بارہ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہین، فرانسیسی سوڈان میں بھی عربی کی تعلیم کا انتظام ہے، وہان دو ہزار ایک سو تیرہ مدارس ہین، جن مین پچھتر ہزار طلبہ پڑھتے ہین، فرانسیسی گائنا مین بھی عربی تعلیم ترقی پر ہے، آئیوری کوسٹ مین اگرچہ مسلمانون کی آبادی صرف گیارہ فیصدی ہے، لیکن

وہان تین سو مسجدین اور چار سو پچیس مدارس قرآن ہین، برٹش نائیجیریا کے تمام مدرسون مین بھی ع، ب، ی
پڑھائی جاتی ہے"

یہ حالت اس زمانہ مین نظر آتی ہے جب افریقہ کی حکومت کی باگ دوسری اقوام کے ہاتھون مین ہے، اگر
اپنی حکومت کے دور مین ہم وہان جلیل القدر علماء، ائمہ اور ادباء اور مختلف علوم و فنون کے ارباب کمال دیکھتے ہین
تو چندان تعجب کی بات نہین،

مؤلف لسان العرب کے مختصر حالات

اس مضمون کے موضوع بحث لسان العرب کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے ضروری معلوم
ہوتا ہے، کہ صاحب کتاب کے حالات چند سطرون مین پیش کر دیئے جائین، یہ بڑے افسوس
کی بات ہے، کہ تاریخ اسلام کے اس جلیل القدر لغوی اور ادیب کے حالات کی جانب تاریخ اور تذکرہ نگارون نے
بہت کم توجہ کی ہے اور کتابون مین اس کے نہایت مختصر اور مجمل حالات ملتے ہین، اگر اتنا بڑا عالم یورپ مین پیدا
ہوا ہوتا، تو اس کی سیرت پر مستقل کتابین لکھی جاتین، اور اس کی زندگی کا کوئی گوشہ ہماری نظرون سے اوجھل
نہ رہنے پاتا، اس ضمن مین یہ عرض کر دینا بھی غیر مناسب نہ ہوگا، کہ صاحب لسان العرب کے حالات زیادہ تر اس کے دو
معاصرین کی روایت پر مبنی ہین، ایک صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی (۶۹۶ھ – ۷۶۴ھ) اس نے اپنی کتاب
نکت الهمیان مطبوعہ ۱۹۱۱ء (ص ۲۷۵ و ما بعد) اور الوافی بالوفیات مطبوعہ ۱۹۳۱ء (ج اول ص ۵۰)
مین اس کے حالات لکھے ہین، دوسرے محمد بن شاکر الکتبی (۶۸۶ھ – ۷۶۴ھ) نے اپنی کتاب فوات الوفیات
مطبوعہ ۱۲۹۹ھ (جلد ۲ ص ۲۶۵) مین حالات قلمبند کئے ہین، بعد کے تمام سیرت نگارون نے انھی دونون سے
استفادہ کیا ہے، اور بیشتر انھی دونون کے بیانات نقل کر دیئے ہین، اس مین حافظ ابن حجر کی الدرر الکامنة
(جلد ۴ ص ۲۶۲) سیوطی کی بغیة الوعاة مطبوعہ ۱۳۲۶ھ (ص ۱۰۶) ابن العماد حنبلی کی شذرات الذہب (جلد ۶
ص ۲۶) سرکیس کی معجم المطبوعات، زرکلی کی الاعلام (ج ۳ ص ۹۹۰ – ۹۹۱) کسی کا استثناء نہین، المنہل العذب
فی تاریخ طرابلس الغرب (ص ۱۵۰) اور مفتاح السعادة (ج اول ص ۱۰۰) مین بھی کچھ حالات مندرج ہین،

ولادت اور تعلیم

محمد نام، جمال الدین لقب، ابوالفضل کنیت، اور الافریقی اور المصری نسبت ہے، پورا
سلسلہ نسب یہ ہے: محمد بن مکرم بن علی بن احمد بن ابی القاسم بن حبقة بن منظور، سیوطی[۱] نے سلسلہ نسب مین علی
(دادا کے نام) کے ساتھ کسی دوسری روایت کے مطابق رضوان بھی لکھا ہے، اور صفدی[۲] نے الرویفعی الانصاری
نسبت درج کی ہے، اس نسبت کے لحاظ سے مؤلف حضرت رویفع بن ثابت صحابیؓ کے خاندان کی یادگار تھے،
ابن منظور اور ابن مکرم کے نام سے عام طور پر مشہور ہین،

۲۲ محرم الحرام ۶۳۰ھ کو دوشنبہ کے دن مصر کے ایک بڑے علم دوست گھرانے مین پیدا ہوئے[۳]، بچپن ہی
سے علم و ادب کی طرف میلان تھا، مختلف اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، ان مین ابن المقیر، مرتضی بن حاتم،
عبد الرحیم بن الطفیل اور یوسف المخیلی زیادہ مشہور ہین، نحو، لغت، تاریخ اور کتابت مین کمال حاصل کیا[۴]، مؤلف
کا انداز تحریر نہایت سلیس، شگفتہ، متین اور سنجیدہ ہے، ادبیات مین نہایت بلند درجہ ہے، نظم و نثر دونون
مین بڑی دستگاہ رکھتے تھے، شعر کے نمونے صفدی اور ابن شاکر نے نکت الهمیان اور فوات الوفیات مین درج کئے ہین

مشاغل

بعض تاریخی حقائق بڑے ہی تعجب انگیز ہوتے ہین، ہماری حیرت کی کوئی حد نہین رہتی جب ہم
یہ دیکھتے ہین، کہ ہمارے اسلاف زندگی کی دوسری مشغولیتون کے باوجود علمی مشاغل مین کتنا انہماک رکھتے تھے،
یاقوت حموی امام ابن جریر کے متعلق لکھتا ہے، کہ اگر ان کی تصنیفات اور تالیفات کے اوراق کو ان کی زندگی
کے دنون پر تقسیم کیا جائے، تو چالیس ورق یعنی اسّی صفحات روزانہ کا اوسط پڑتا ہے، حافظ ابن حجر کی تصانیف
کتنے مختلف علوم پر ہین، فتح الباری، اصابہ، درر کامنہ اور تہذیب جیسی ضخیم کتابیں ابن حجر کے علم و فضل کی شاہد
ہین، سیوطی کی روایات کے استناد و عدم استناد کے متعلق جو بھی کہا جائے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے

[۱] بغیة الوعاة ص ۱۰۶، [۲] نکت الهمیان ص ۲۷۵، [۳] ایضاً، [۴] الدرر الکامنہ ج ۴ ص ۲۶۲، ۲۶۳،
نکت الهمیان میں عبد الرحیم کی بجائے عبد الرحمن بن الطفیل مرقوم ہے جو زیادہ قرین صحت ہے،
[۵] بغیة الوعاة ص ۱۰۶،

کو چار پانچسو کے درمیان کتابیں ان کے قلم سے نکلیں، یاقوت حموی ابن کثیر، ابن تیمیہ اور دوسرے بے شمار علماء ہیں جن کے قلم کی روانی اور برق رفتاری دیکھکر ایک انسان انگشت بدندان رہجاتا ہے، اور اندازہ نہیں کرپاتا کہ یہ بزرگ لکھنے پڑھنے کے لئے اتنا وقت کیسے نکال لیا کرتے تھے،

ہمارے مؤلف کو کتب بینی اور تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا، باوجودیکہ قاہرہ مین مدت العمر دیوان الانشاء سے وابستہ رہے، پھر طرابلس مین نظارت اور قضاء کے فرائض انجام دیتے رہے، لیکن لکھنے پڑھنے کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا، کہ ان مشغولیتون کے باوجود تاریخ ادب کی بہت کم کتابین ایسی ہونگی جو ابن منظور کی نگاہ سے بچ سکی ہون گی، محض مطالعہ ہی کا شوق نہ تھا، بلکہ اس کے ساتھ تالیف و تصنیف کا بھی ذوق تھا، ابن شاکر نے فوات الوفیات میں ان کو کثیر الخط لکھا ہے، صلاح الدین صفدی نے خود ابن منظور کے صاحبزادے قاضی قطب الدین کا یہ بیان نقل کیا ہے، کہ اُن کے والد ابن منظور نے پانسو کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی چھوڑین[۳]، صفدی کا بیان ہے کہ "وما اعرف فی کتب الادب شیئا الا اختصرہ" سیوطی لکھتے ہین کہ روایات ونقل کے اعتبار سے ابن منظور کی مختصرات کی تعداد پانچ سو مجلدات تک پہنچتی ہے[۳]، ابن منظور نے جو مختصرات ومختارات لکھے ہین، ان مین سے چند حسب ذیل ہین:

(۱) مختار الاغانی بہ ترتیب حروف تہجی (۲) مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر قریبًا چوتھائی حصہ مین اختصار کیا ہے (۳) مختصر تاریخ بغداد للسمعانی (۴) مختصر مفردات ابن البیطار (۵) مہذب سرور النفس بمدارک

---

[۱] فوات الوفیات، دیوان الانشاء مین خدمت کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی، اس کے لئے بڑے علم وفضل کی ضرورت تھی، قلقشندی نے صبح الاعشی میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ کتنے علوم وفنون مین کمال حاصل کئے بغیر دیوان الانشاء مین کام کرنا قطعًا ناممکن تھا[۲] نکت الهمیان ص ۲۰۷،

[۳] بغیۃ الوعاۃ ص ۲۰۶، اس زمانہ مین قدیم علماء کی مطول کتابون کو محفوظ کرنے کے لئے اون کی تلخیص کا زیادہ رواج تھا،

الحواس الخمس للتیفاشی (۶) مختصر العقد لابن عبدربہ (۷) مختصر ذخیرہ لابن بسام (۸) مختصر زہر الآداب للحصری (۹) مختصر یتیمۃ الدہر للثعالبی (۱۰) مختصر نشوان المحاضرۃ (۱۱) مختصر صفوۃ الصفوۃ (۱۲) مختصر تاریخ الخطیب (۱۳) مختصر الحیوان للجاحظ (۱۴) اختیار الازہار فی اللیل والنہار،

انہی چند کتابون سے اندازہ ہوسکتا ہے، کہ ابن منظور کتب بینی اور تصنیف و تالیف مین کس درجہ استغراق اور انہماک رکھتے تھے کتنی ضخیم ضخیم کتابون کو اول سے آخر تک بنظر غائر پڑھا، یاد رکھا، اور پھر ان کے مختارات اور مختصرات لکھے، ایک الاغانی ہی کو لے لیجئے، کہ بقول صاحب الوافی بالوفیات[۱] ابو الفرج اصفہانی نے اس کتاب کو پچاس برس کی طویل مدت مین تالیف کیا، پھر غور فرمائیے، کہ اس کتاب کے مطالعہ اور بلحاظ حروف تہجی اس کے اختیار اور ترتیب کے لئے کتنی مہلت اور محنت کی ضرورت تھی، یہ بھی پیش نظر رہے کہ مؤلف کے لئے تنہا یہی ایک کام نہ تھا، بلکہ دفتری مشاغل بھی تھے، اور پھر تنہا یہی ایک کتاب مؤلف کے قلم کا ثمرہ نہیں ہے، بلکہ ایسی بہت سی کتابین ہین جن مین سے ایک ایک کے مطالعہ کے لئے عمر درکار ہے،

ابن العماد حنبلی کے قول کے مطابق ابن منظور مصر اور دمشق مین حدیث کا درس بھی دیتے رہے ہین[۲]، اور سیوطی رقمطراز ہین کہ امام سبکی اور حافظ ذہبی نے ابن منظور سے روایت بیان کی ہے[۳]، لیکن ان کا شمار محدثین کے اس زمرہ میں کیا ہے جو لم یبلغوا درجۃ الحفظ والمنفردین بعلو الاسناد[۴] مگر جہان تک نحو ولغت کا تعلق ہے ابن منظور کا شمار ان علوم کے ائمہ مین ہے[۵]، حافظ ابن حجر نے ابن فضل اللہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ ابن منظور آخری عمر میں بینائی سے محروم ہوگئے تھے[۶]، ظاہر ہے کہ یہ محرومیٔ بصارت کتب بینی اور کتب نویسی مین حد درجہ انہماک کا نتیجہ تھی، آخر مین مصر مین قیام اختیار کیا، اور وہیں بیاسی برس کی عمر میں شعبان ۷۱۱ھ مین وفات پائی[۷]،

---

[۱] جلد اول ص ۰ ۵ [۲] شذرات الذہب ج ۶، ص ۲۶ [۳] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۰۶ [۴] جلد اول ص ۱۶۳ [۵] ،، ص ۲۲۹ [۶] الدرر الکامنہ جلد ۴ ص ۲۶۳ [۷] حسن المحاضرہ، ج ۱ ص ۱۶۳

ابن شاکر نے[1] ابن منظور کے تشیع بلا رفض کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن معاصرانہ چشمک سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں، دوسرے سیرت نگاروں نے بھی اس کی تقلید میں اس کو نقل کر دیا، اور یہ نہ سوچا کہ یہ الزام کہاں تک حقیقت و اصلیت پر مبنی ہے،

لسان العرب ابن منظور کی سب سے قیمتی اور اہم تالیف لسان العرب ہے، اس کا پہلا ایڈیشن مصر سے بیس ضخیم جلدوں میں شائع ہوا، یہ عربی زبان کا بڑا مستند اور مفصل لغت ہے، کتاب کے نام کے ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا، کہ ابن منظور ہی پہلا مؤلف نہیں، جس نے لسان العرب کے نام سے عربی کا اتنا ضخیم لغت ترتیب دیا ہو، اس سے کئی صدی پہلے شیخ ابو علی سینا (۳۷۰ھ - ۴۲۸ھ) نے اسی نام سے ایک ضخیم لغت مرتب کیا تھا، ڈاکٹر جمیل صلیبا نے اپنی کتاب ابن سینا کے صفحہ ۳۶ پر عربی لغت کی ایک کتاب موسوم بہ لسان العرب دس جلدوں میں ابن سینا کی جانب منسوب کی ہے، شہرزوری کی کتاب نزہۃ الارواح میں ابو علی سینا کے ترجمہ کے تحت زیادات میں مرقوم ہے:

ثم صنف الشیخ کتاباً فی اللغۃ وسماہ لسان العرب، لم یصنف مثلہ فی اللغۃ ولم ینقل الی البیاض فبقی علی مسودتہ لم یھتد احد الی ترتیبہ"

شیخ کی لسان العرب کی عدم موجودگی میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ ابن منظور نے اپنی اس کتاب کا نام محض اتفاقی طور پر رکھا یا مستعار لیا، ورنہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لسان العرب پہلی لسان العرب کا کہاں تک چربہ ہے

وجہ تالیف ابن منظور کے لغت سے پہلے بھی عربی کے مستند لغات موجود تھے، خلیل بن احمد (المتوفی ۱۷۵ھ) کی کتاب العین اگرچہ اب ناپید ہے[2]، لیکن بعد کے مولفوں نے اس سے استفادہ کیا ہے، اور اندلس کے مشہور مصنف ابوبکر زبیدی (المتوفی ۳۷۹ھ) نے اس کا اختصار بھی کیا، اس کے بعد ابن درید (المتوفی ۳۲۱ھ) نے کتاب العین

[1] فوات الوفیات ج ۲ صفحہ ۲۶۵،

[2] لسان العرب ج ۱ صفحہ ۲،

کے انداز پر کتاب الجمہرۃ فی اللغۃ لکھی، بعد کی مشہور کتب لغت میں سے ابو علی القالی (المتوفی ۳۵۶ھ) کی البارع، ابو منصور الازہری (المتوفی ۳۷۰ھ) کی التہذیب، صاحب ابن عباد (المتوفی ۳۸۵ھ) کی المحیط، ابو الحسین ابن فارس (المتوفی ۳۹۵ھ) کی المجمل، الجوہری (المتوفی ۳۹۸ھ) کی الصحاح، ابو غالب قرطبی (المتوفی ۴۳۶ھ) کی الموعب، ابن سیدہ (المتوفی ۴۵۸ھ) کی المحکم، زمخشری (المتوفی ۵۳۸ھ) کی اساس البلاغہ اور صاغانی (المتوفی ۶۶۰ھ) کی العباب قابلِ ذکر ہیں، لیکن ان کتب کی موجودگی بھی ابن منظور کے لئے وجہ تسلی نہ ہوئی، اور ان کو ان میں سے ہر ایک کتاب میں کچھ نہ کچھ ایسی کمی اور کوئی نہ کوئی خامی نظر آئی کہ ایک لغت کی تالیف کی ضرورت محسوس کی انھیں اگر کسی کتاب میں علم و ادب کا کوئی بڑا ذخیرہ نظر بھی آیا تو اسکی ترتیب انکی نگاہ میں ناپسندیدہ ٹھہری اور اگر کسی کی ترتیب تسلی بخش نظر آئی تو اسکو علمی و ادبی خامیوں سے مبرا نہ پایا اسلئے ایک ایسے جامع لغت کی ترتیب کی ضرورت محسوس کی جو انکے نقطۂ نظر سے ترتیب اور علم و ادب کے ذخیرہ دونوں لحاظ سے تسلی بخش اور قابلِ اعتبار ہو، اس مقصد کے پیش نظر ابن منظور نے لسان العرب کی تیاری شروع کی، لیکن انھیں اپنے پیش رو مؤلفین لغت کی طرح الفاظ کی تشریح و تحقیق کے لئے بڑے طول طویل سفر اختیار نہیں کرنے پڑے، اور نہ بے آب و گیاہ صحراؤں کی خاک چھاننی پڑی، مؤلف نے کتاب کے دیباچے میں یہ اعتراف کیا ہے، کہ انھوں نے پہلی کتب لغت پر انحصار کرتے ہوئے انہی کی مختویات سے استفادہ کیا ہے[3]، سیوطی بغیۃ الوعاۃ میں لکھتے ہیں:

"جمع فی لسان العرب بین التہذیب والمحکم والصحاح وحواشیہ والجمہرۃ والنہایۃ"

لیکن احمد پاشا تیمور، سیوطی کی تغلیط کرتے ہوئے اپنی کتاب تصحیح لسان العرب میں یوں رقمطراز ہیں:

والصواب ان الجمہرۃ لیست مما جمعہ ابن منظور، بل مبنی کتابہ علی خمسۃ فقط وھی التی صرح باسمائھا فی خطبتہ؛

لسان کی ترتیب مولفین لغت نے اپنی کتبِ لغت کو تین طریقوں سے ترتیب دیا ہے،

[3] لسان العرب ج ۱ ص ۱۳،

(۱) خلیل نے کتاب العین کو مخارج الفاظ کے لحاظ سے مرتب کیا ہے، المحکم اور التہذیب مین بھی اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے،

(۲) ابن درید نے الجمہرۃ مین حروف تہجی کی اصل ترتیب کے لحاظ سے الفاظ کو ترتیب دیا ہے، المجمل، المحیط، اساس البلاغۃ وغیرہ بھی اسی طریقہ سے مرتب کی گئی ہین،

(۳) تیسرے گروہ کا امام جوہری ہے، اس نے الصحاح مین نیا انداز ترتیب اختیار کیا، اور الفاظ کے حرفِ آخر کے اعتبار سے کتاب مرتب کی، لسان العرب، قاموس اور تاج العروس مین بھی یہی ترتیب اختیار کی گئی ہے،

کتاب کی اہمیت لسان العرب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے، کہ مؤلف نے ساٹھ ہزار الفاظ کے مصادر اور مادّون پر بحث کی ہے، اور ان کی تشریح و توضیح مین کلام عرب، ان کے ضرب الامثال، محاورات، خطبات، آیات قرآنی اور احادیثِ نبوی سے استشہاد کیا ہے، اس ضمن مین کم و بیش سترہ سو شعرا کے نام اور بے شمار اشعار لسان العرب میں محفوظ ہو گئے ہین،

غور فرمایئے کہ اتنے ضخیم اور مفصل لغت کی تدوین کے لئے کتنے صبر و استقلال، عزم و ہمت، علم و فضل، محنت و مشقت اور ذہانت و ہوشمندی کی ضرورت تھی، آج اس ترقی کے زمانے مین اگر ایک اتنا بڑا لغت لکھنا ہو تو ایک چھوڑ کئی علمی مجالس قائم کرنی پڑین، بلکہ کیجاتی ہین، مولفین کے بورڈ بنائے جاتے ہین، مختلف شعبون کے ماہرین کی امداد حاصل کیجاتی ہے، تب کہیں جا کر یہ بیل منڈھے چڑھتی ہے، لیکن اس زمانے مین جب کہ یہ علمی سہولتین مفقود تھین، نہ پریس اور مطابع تھے، نہ نقل و حمل کے وسائل و ذرائع آج کے جیسے تھے، اتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھانا کتنا مشکل کام تھا، اور اس کو تکمیل تک پہونچانا تو اور بھی دشوار تھا، مگر آفرین ہے ان اولوالعزم بزرگون کی جوانمردی اور ہمت پر جنھون نے اتنے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے کہ انھین دیکھکر آج دنیا فرط حیرت و استعجاب سے انگشت بدندان رہ جاتی ہے،

سالہا سال کی مسلسل و پیہم محنت کے بعد ابن منظور نے لسان العرب کو ۶۸۹ھ مین پایۂ تکمیل تک پہنچایا، اور لغت کے ساتھ ساتھ علم و ادب کا اتنا شاندار اور قابلِ فخر ذخیرہ جمع کر دیا، کہ یہ کتاب محض ایک لغت ہی نہین بلکہ عربی علوم کی انسائیکلوپیڈیا بن گئی، اگر ابن منظور اور کوئی کتاب نہ لکھتا اور صرف لسان العرب ہی چھوڑ جاتا تو تنہا یہی اتنی بڑی یادگار تھی، کہ رہتی دنیا تک اس کا نام فراموش نہ کیا جا سکتا،

یورپ کے بڑے بڑے مستشرقین نے دوسری زبانون کے مقابلہ مین عربی زبان و لغت کی وسعت کا اعتراف کیا اور ایڈورڈ ولیم لین (۱۸۰۱ء – ۱۸۷۶ء) جس نے عربی لغت کے مطالعہ اور تدوین مین ساری عمر صرف کر دی، اس اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا، کہ عربی زبان لغاتِ علمی تحقیق، وسعتِ نظر اور محنت و تفصیل کے اعتبار سے تمام لغات سے سبقت و فوقیت لے گئی ہے[۱] لیکن المانی مستشرق نلدکے اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود، دبی زبان سے اس مین وسعتِ نظر کی کمی کا بھی اظہار کیا ہے، افسوس کہ اس نے لسان العرب نہین دیکھی، ورنہ اس کو ابن منظور کی وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا، وہ عجمی الفاظ کی اصلیت و ماخذ کا پتہ بھی دیتا ہے، چند مثالین ملاحظہ ہون،

"الفلسفۃ الحکمۃ اعجمی (۱۱: ۱۸۰، سطر ۳) والتریاق بکسر التاء معروف فارسی معرب نیز (حبق) الجوسق۔۔۔۔ معرب واصلہ کوشک بالفارسیۃ (۱۱: ۳۱۵) القنذع والقندع والقنذع کلہ الدیوث سریانیۃ لیست بعربیۃ محضۃ (۱۰: ۱۷۷) نستق کانہ بلسان الروم تکلمت بہ العرب (۱۲: ۲۳۰)

اسی طرح جہان کہین اس قسم کے الفاظ آگئے ہین، ابن منظور نے ان کے ماخذ اور ان کی اصل بتانے کا پورا اہتمام کیا ہے، ان چار مثالون سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ عربی لغت نویس، فارسی، سُریانی، ترکی، رومی وغیرہ ماخذون کا بھی پتہ دیتے ہین،

تسامحات کسی کتاب کے متعلق نقص سے یکسر برأت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے لسان العرب جیسی

---

[۱] دیباچہ مدالقاموس [۲] لسان العرب ج ۴ صفحہ ۴۹،

بڑی کتاب مین مسامحات کا رہجانا کوئی تعجب کی بات نہین کہ ایک انسان کا حافظہ اور علم کہان تک کام دیسکتا ہے، لیکن افسوس ان لوگون پر ہے جنھون نے لسان العرب کی نقل مین اس کے تسامحات پر نظر نہ ڈالی، اور انھین جو کچھ ملا بے کم وکاست نقل کردیا، مثلاً لسان مین معقل بن خویلد کا یہ شعر مرقوم ہے، [۱]

وسود جعاد الرقا ب مثلهم يرهب الراهب

مصحح نے اس کی تصحیح کی زحمت اٹھائے بغیر حاشیہ پر لکھدیا "کذا فی الاصل بحذف بعض الشطر الاول" تاج العروس کے مولف شہیر سید مرتضیٰ زبیدی (المتوفی ۱۲۰۵ھ) نے بھی لسان العرب کے تتبع مین یہی ناقص شعر نقل کردیا، وہان بھی حاشیہ نگار صاحب نے لکھدیا کہ لسان مین اسی طرح مرقوم ہے، حالانکہ اشعار الہذلیین مین یہ شعر یون ملتا ہے:

وسود جعاد غلاظ الرقا ب مثلهم يرهب الراهب

لسان العرب (۱۵: ۱۲۳) مین عبید بن الابرص کا ایک شعر یون مندرج ہے:

اعاقر كذات رحم ام غانم كمن يخيب

لیکن عبید کے دیوان (ص ۷) مین یہ شعر اس طرح ہے:

اعاقر مثل ذات رحم ام غانم مثل من يخيب

ایک دو مثالین اس کی بھی ہین، کہ ایک جگہ ایک شعر ایک ترتیب سے درج ہے، لیکن دوسرے مقام پر اسی شعر کا مصراع اول مصراع ثانی بن گیا ہے، مثلاً حمید الارقط کے شعر مین (۹: ۴۱) اور (۱۸: ۱۶) مین مصرعے الٹ گئے ہین، یا (۲۰: ۲۹) پر مؤلف نے بطور استشہاد کمیت کا شعر درج کرنا چاہا ہے، اور "قال الکمیت" لکھکر شعر کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت مؤلف کو شعر بھول گیا، اور بعد مین درج کر دینے کے لئے جگہ خالی چھوڑ دی لیکن بات ذہن سے اُتر گئی، اور شعر درج نہ ہوسکا،

---

[۱] لسان العرب جلد ۴ صفحہ ۹۴ [۲] تاج العروس ج ۲، صفحہ ۳۲۰،

(۴: ۴۴، ۴۴) پر ایک شعر ہے،

تركض الخيل فيها بين بست الى الاودات تنحط بالنهاب

اس سلسلہ مین مؤلف نے "قال عباس بن" لکھکر شاعر کے باپ کا نام درج نہین کیا، اور جگہ خالی چھوڑ دی، لیکن بعینہ یہی شعر دوسرے مقام [۱] پر درج کرتے ہوئے لکھا "قال عباس بن مرداس السلمی" (ج ۲، ص ۳۲)

اس کی مثال بھی ہے کہ مؤلف کو شعر نقل کرتے وقت شاعر کے متعلق شک ہوگیا ہے اور بجائے ایک شاعر کا نام لکھنے کے دو کا لکھ دیا ہے مثلاً (۲: ۳۳۶) پر لکھتا ہے "قال ابو ذویب او صخر الغی" بعض دفعہ ایسا بھی کہ ایک مقام (۲: ۲۰) پر ایک شعر عبد اللہ بن غنمۃ الضبی کی جانب منسوب کیا، پھر بعینہ وہی شعر دوسرے مقام (۱۹: ۱۴۳) پر اسی شاعر کی جانب منسوب کرنے کے بعد انتساب مین شک پیدا ہوگیا، پھر خود ہی اس کی تصحیح کردی، "والصحیح انه لسلمة بن عویة الضبی" یا ایک شعر ایک مقام پر (۶: ۷) غسان بن وعلہ کی جانب منسوب کیا ہے لیکن وہی شعر دوسرے مقام (۱۹: ۱۹۴) النمر بن تولب کی طرف منسوب کردیا، اس قسم کی مثالین اور بھی ملتی ہین، انتساب مین اختلاف کے علاوہ خود شعرون مین بھی اختلاف پایا جاتا ہے، ایک مقام پر ایک شعر درج ہے، دوسرے مقام پر وہی شعر تھوڑے سے اختلاف سے مرقوم ہے، اس کی مثالیں بھی بہ کثرت ملتی ہین،

بعض ایسے اشعار ہین کہ مؤلف لسان العرب نے ان کو کسی شاعر کی جانب منسوب کیا ہے لیکن وہ اشعار اس شاعر کے مطبوعہ دیوان مین نہین ملتے، مثلاً ذیل کا شعر طرماح کی جانب منسوب کیا ہے، (۶: ۲۵۰)

قانئ اللون حديث الزمام كل مشكوك عصا فيره

یہ شعر طرماح کے دیوان میں موجود نہین، اور نہ اس کے ملحقہ ضمیمہ مین ہے، جس مین مختلف کتب سے اس کے اشعار جمع کرکے درج کئے گئے ہین، بعض اشعار لسان العرب اور دواوین مین باختلاف الفاظ پائے جاتے ہین،

اسی طرح اور بھی بہت سے مسامحات ہین جنھین مین نے لسان العرب کی فہارس مرتب کرتے وقت جمع کیا تھا، اگر ان سب کا ذکر کیا جائے تو اس کے لئے کئی مقالون کی ضرورت ہوگی،

زندگی مین غم کیون ہی؟

از

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا، استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

بے خلش ہا زیستن نا زیستن! — باید آتش در تہ پا زیستن

زیستن این گونہ تقدیر خودی است — از ہمین تقدیر تعمیر خودی است (اقبال)

ابتلا، یا آزمایش انسان کی تقدیر ہے، اور ابتلا ہوتی ہے زندگی کی محبوب و مرغوب چیزون کے روک لئے جانے یا فنا کر دئیے جانے سے، ان پر آفات کے نزول سے، ان کے حصول مین مشکلات کے پیدا ہونے سے، خلش سے، درد و غم سے، رنج و الم سے، قلب کے تار ٹوٹنے سے! یا زیادہ جامع الفاظ مین یون کہو، خوف سے، بھوک سے، جان و مال و ثمرات کے نقص و کمی سے، اور ابتلاء کا مقصد سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، خودی کی پختگی ہوتی ہے، حیات کی زیادتی ہوتی ہے، قوت کی توفیر ہوتی ہے، خاص و عام رحمتون و راحتون کا نزول ہوتا ہے! اور جو شخص ابتلاء سے بھاگنا چاہتا ہے، وہ ایک کلی و وجوبی قانون کی ہمہ گیر قوت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اور نادانستہ طور پر اپنا ہی نقصان چاہتا ہے، اپنی خودی کی تکمیل و تعمیر نہین چاہتا، حیات و قوت کی توفیر نہین چاہتا! وہ بھول جاتا ہے کہ

دوام ما ز سوز نا تمام است — چو ماہی جز تپیش بر ما حرام است

مجو ساحل کہ در آغوش ساحل — تپیدے یک دم و مرگ دوام است! (اقبال)

لہ یہ مقالہ حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس نظام آباد دکن مین سنایا گیا،

اپنے اس دعوی کی تائید مین ہم آپ کو کچھ دیر کے لئے فکر و نظر کی دعوت دیتے ہین، اور کائنات و فطرت انسانی کے چند کلی و ضروری قوانین کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہین، ع

یک تنقیہ دماغ می باید کرد!

انسان احتیاج کا دوسرا نام ہے، انسان کی عضویت کی تحدید و تقیید ہی سے احتیاج پیدا ہوتی ہی، یعنی اس کی فطرت ہی مین احتیاج ہے، وہ حاجت مند ہے، فقیر ہے، اور درد نتیجہ ہے اسی فقر و احتیاج کا! فطری طور پر وہ اس درد کی دوا چاہتا ہے:

عالم ہمہ در دست و دوامی خواہد — از خوان کرم برگ و نوامی خواہد

کس بے حاجت نمی تواند دیدن — درویش غذا شہ اشتہا می خواہد

(سحابی استرآبادی)

اب اس عالم اسباب و علل مین جس کی تشبیہ انگارہ سے دیجا سکتی ہے، مجاہدہ اور عمل ہی سے احتیاج و فقر اور درد و غم بڑی حد تک دور کئے جا سکتے ہین، جو اپنی بنیاد و اساس کے طور پر علم صحیح کو فرض کرتا ہے، مجاہدہ بغیر علم صحیح کے ممکن نہین، اور علم صحیح عمل سے علحدہ ہو کر نافع نہین ہو سکتا، اس لئے ہم انھین دو پہلوؤن کو یہان اختصار کے ساتھ پیش کر کے اپنے دعوی کی تائید کرین گے،

یاد رکھو کہ انسان کی زندگی اس معنی مین ہمیشہ خطرناک زندگی ہے، کہ درد و غم، سوز و الم اس کی ماہیت مین داخل ہین، کائنات کے اندرونی اسرار سے جو لوگ واقفیت رکھتے ہین، ان کا ایقان ہے، کہ کائنات کا مبدء حق تعالی ہین، جو حکمت و خیر کے اعتبار سے مطلق و لامحدود ہین، وہی اس کائنات پر حکمران ہین، حکم ان ہی کا چلتا ہے، مشیت ان ہی کی نافذ ہو رہی ہے، لہذا یہ کائنات مظہر ہے خیر و حکمت کا، ہر درد و غم جو انسان کی زندگی کا ساتھ نہین چھوڑتے، اور ہر رنگ مین انسان جو جلتا رہتا ہے، اس مین کونسی حکمت ہے، اور خیر کا کونسا نمایان پہلو ہے؟ ان ہی واقفان راز کا بیان ہے، کہ اہل ذکر یا مشاہدہ پر اس کی حکمت مبرہن ہے، اس کی

توضیح میں قوانین کی شکل میں پیش کیجا سکتی ہے،

(۱) درد و غم، سوز و الم نتیجہ ہے جرم و معصیت کا، گناہ و بدکرداری کا، ذمائم اخلاق اور ان سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال کا، اس راز کو قرآن حکیم نے اس آیت میں پیش کیا ہے :-

وَمَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ	تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی
اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ	ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت
(پ ۲۵ ع ۵)	سے تو درگذر ہی کر دیتا ہے،

اسی راز کو کسی اور جگہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں ظاہر فرمایا گیا ہے :-

اَوَلَمَّا اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَدْ اَصَبْتُمْ	اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی، کہ تم اس
مِّثْلَیْھَا قُلْتُمْ اَنّٰی ھٰذَا قُلْ ھُوَ مِنْ	سے دو چند پہنچا چکے ہو، تو کہتے ہو، کہ یہ کہاں
عِنْدِ اَنْفُسِکُمْ ۝	سے آئی، آپ فرما دیجئے کہ یہ تکلیف تم کو تمہارے
(پ ۴ ع ۸)	ہی طرف سے پہنچی،

صاحب کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا کہ انما ھی اعمالکم ترد علیکم[1] یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں، قرآن و خبر سے اس راز کو معلوم کر کے حکما و صوفیاے اسلام نے یہ اصول قرار دے لیا ہے، کہ

انّ جمیع الوجود یقابلکم بحسب ما برز منکم من الاعمال فانظروا کیف تکونون،

فانّ الظل تابع للشاخص فی العوج والاستقامۃ (شیخ ابوالنجیب)

یعنی جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسے ہی بدلہ بھی دیا جاتا ہے اس لئے ذرا اپنے اعمال پر نظر رکھنا کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے، اگر کوئی شے ٹیڑھی ہے، تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہو گا، اور اگر سیدھی ہے

[1] انما ھی اعمالکم احصیھا علیکم فمن وجد خیرا فلیحمد اللہ ومن وجد غیرھا فلا یلومن الا نفسہ

محال کی تمنا کی، من طلب استقامۃ الظل مع عوج الشاخص فقد رام المحال، اسلئے یاد رکھو اور خوب سمجھ لو، کہ یہ جو سوز و غم تمہارے قلب کو کھائے جا رہا ہے، یہ نتیجہ ہے تمہارے ہی اعمال بد کا، مثلاً جب تم کسی کو دیکھتے ہو کہ وہ تم کو ناحق آزار پہنچا رہا ہے، بے وجہ تکلیف دے رہا ہے، زبردستی ستا رہا ہے، تو ذرا سوچ کر دیکھو کہ کیا تم نے بھی اسی قسم کی حرکت کسی معصوم و مظلوم کے ساتھ نہیں کی تھی، جس نے تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی ؛ ممکن ہے کہ فوراً یاد نہ آئے لیکن تحت الشعور نفس کی گہرائیوں میں یہ واقعہ ضرور مندرج ہے، وہ ایک روز تمہارے غور و فکر کرنے پر ظاہر و باہر ہو جائے گا، ہر حادثہ اور مصیبت کے وقت اسی قسم کی سوچ بچار سے کام لیا جائے اور دیانت فکری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو آدمی بالآخر اس امر کا قائل ہو جاتا ہے، کہ اللوم علی لا علیہم، ملامت مجھ پر ہے، میرے دشمنوں پر نہیں، کیونکہ حقیقی معنی میں میرا دشمن کوئی نہیں، میں ہی اپنی ذات کا بڑا دشمن ہوں، دوسرے دشمن، میرے ہی طبیعت کے پیدا کردہ ہیں، ع

زادۂ طبع من اند آنانکہ خصمان من اند (خاقانی)

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی جان و دل سے تصدیق کرنے لگے گا، کہ اعدیٰ عدوک نفسک التی بین جنبیک "تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں میں ہے" درد و الم تیرے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے، یداک کسبتا و فوک نفخ[1]

جو مصیبت و آفت، درد و غم گناہوں کی عقوبت کے طور پر وارد ہوتے ہیں، ان کی پہچان بس یہی ہے، کہ انسان نزول بلا پر صبر نہیں کرتا، اپنی جیسی بے بس و بے کس ہستیوں کی طرف اپیل کرتا ہے، جزع و فزع کرتا ہے، شکایتوں کا دفتر کھول دیتا ہے، مقام شکوی میں داخل ہو جاتا ہے، اور مقام صبر سے خارج ہو جاتا ہے، مصیبت کے دفع کرنے کا واحد علاج یہی ہے، کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جانب توجہ کرے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، قلب کا تصفیہ کرے، اپنے سر کا اوہام باطلہ سے تخلیہ کرے، خیر کی جانب لوٹے، نور کی طرف پلٹے، ظلمتوں سے نکل جائے، غم و الم

[1] قول شیخ اکبرؒ، تیرے ہاتھوں نے کمایا، اور تیرے منہ نے پھونکا،

کی تاریکیان خود بخود دور ہوجائین گی، اور راحت ومسرت کا نور اس کی رگ وپے میں سرایت کرنے لگے گا،

درد وغم وہ اشارات ہین جو انسان کو اس کے اعمال کی جانب متوجہ کرتے ہین، یہ خیر کی طرف ہدایت کرتے ہین، ان کا وجود اس پر اسرار کائنات مین بے معنی نہین، شر محض نہین، یہ خیر کے تحقق کا زبردست آلہ ہین، خیر کی منزل تک لیجانے کا نہایت قوی ذریعہ ہین، یہ جرائم ومعاصی کی ظلمتون کو رفع کرنے مین نور کا کام دیتے ہیں، ایک لفظ مین یون کہو کہ یہ خام کو پختہ بنانے کیلئے ضروری ہین، اقبال نے اسی مفہوم کو یون ادا کیا ہے :

جہانِ ما کہ جز انگارۂ نیست　　　اسیرِ انقلابِ صبح وشام است

زسوہانِ قضا ہموار گردد　　　ہنوز این پیکرِ گِل ناتمام است

سوہانِ قضا پیکر خاکی کے نقص وتحدید کو کجی وخامی کو، غم والم کے انگارہ سے دور کرتا جاتا ہے اور اس کو کمال کی طرف کھینچ لاتا ہے !

(۲) بعض دفعہ درد والم سوز وغم، معاصی وجرائم کی عقوبت کے طور پر نہین عائد کئے جاتے، مقصود محض سزا دینا نہین ہوتا، بلکہ تطہیر ہوتی ہے، تکفیر وتمحیص ہوتی ہے، شہوتون ولذتون کے اتباع سے نفس مین تاریکی پیدا ہوتی ہے، اوامر الٰہی کی مخالفتون سے قلب مردہ ہوجاتا ہے، درد وغم سوز والم نفس سے ظلمتون کو رفع کرتے ہین، مردہ قلب کو جلاتے جگاتے ہین، حق تعالیٰ کی طرف اُس کا رُخ پھیرتے ہین، جو نور مطلق ہین، وہ ان کی طرف رُخ کرکے نورانی ہوجاتا ہے، اور گناہون کی ساری تاریکیان دور ہوجاتی ہین، بلاؤن اور مصیبتون سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل وخوار ہوجاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے، شہوتون اور لذتون سے ٹوٹ کر ان سے جڑجاتا ہے، ربط قائم کرلیتا ہے، غم سے زیادہ مؤثر تطہیر کے لئے کوئی اور شے نہیں، اور بلا آتی ہے اسی تطہیر کی خاطر ع

این بلائے دوست تطہیرِ شما است　　　(رومی)

اسی مقصود کے پیش نظر، کفکر عارف رومؒ درد وغم (قبض) سے رنجیدہ نہ ہونے کی تاکید فرماتے ہین اور اس کو سالک کے لئے مفید قرار دیتے ہین،

چونکہ قبض آمد تو در وے بسط بین　　　تازہ باش وچین میفگن بر جبین

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو　　　آن صلاحِ تست آیس دل مشو!

اسی خیال سے صوفیۂ کرام نے بلا ومصیبت کو حق تعالیٰ کے انعامات سے زیادہ بہتر قرار دیا ہے، آلامِ محبوب بہ از انعامِ محبوب، بلا ہی عطا ہے، اور عطا پر غم کیسے، بلا از دوست عطا است واز عطا نالیدن خطا ست !

کے زآزار تو بیزار شود جانِ حسین　　　زخم چون از تو رسد باہمہ آزار خوشیم

(منصور حلاج)

بلا وغم جب تکفیر وتمحیص کے لئے آتے ہین، تو اس کی صاف علامت یہی ہے، کہ مبتلیٰ جزع وفزع نہین کرتا، صبر جمیل سے کام لیتا ہے، دوستون اور ہمسایون کے سامنے اپنی مصیبت کو پیش کرکے شکوی وشکایت نہین کرتا، صبر کرکے بے حساب اجر کا امیدوار رہتا ہے !

(۳) اور بعض دفعہ بلا ومصیبت محض تطہیر وتکفیر کے لئے بھی نہین آتی، بلکہ ارتفاعِ درجات اور بلوغِ منازل عالیات اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ قانون اہل اللہ کے متعلق ہے جنھون نے اپنے نفس کا تزکیہ کرلیا ہے، جن کے قلوب پاک ومصفی ہین، جنھیں ربط بحق قائم ہے، دیکھا جاتا ہے کہ کثرت سے بلائین ان ہی پر نازل ہوتی ہین، چنانچہ البلاء للولاء، بلا دوستون کے لئے ہوتی ہے، مشہور خاص وعام یہی ہے، اس قانون کو رازدانِ حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم نے یون بیان فرمایا ہے :

اذا احب اللہ عبدًا ابتلاہ فان صبر اجتباہ وان رضی اصطفاہ،

یعنی جب حق تعالیٰ بندے سے محبت کرتے ہین تو اس کو مصیبت مین مبتلا کرتے ہین، اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ بنالیتے ہین، اور اگر راضی رہے تو برگزیدہ قرار دے لیتے ہین، اسی لئے حضرت معروفؒ فرمایا کرتے تھے:

لیس بصادق فی دعواہ من لم یتلذذ　　　جو اپنے مولا کی مار سے لذت نہین لیتا وہ سچا

بضرب مولاہ،　　　غلام ہی نہین !

اسی مفہوم کو کسی عاشق نے ان مؤثر پیرایے نغمون مین ادا کیا ہے:

جان بلب آمد ز درد کردم از دو دو طلب — گفت اگر تو عاشقی صبر کن رضا طلب

یار و ے کہ بر سرت تیغ زند تو دم مزن — سر بفداے یار کن ہیچ ز خون بہا طلب

محوے مراد یار شو تا شود او بکام تو — قابل التفات نیست عاشق مدعا طلب

انسان کی فطرت کے اقتضاءات وقابلیات کا جن کو حکیمانہ علم حاصل ہے، وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہین، کہ منازلِ عالیہ تک رسائی کے لئے درد وغم لابدی ولازمی ہے، تقیید جو انسان کی فطرت ہے، اطلاق کے کسی درجہ کی متحمل نہین ہوسکتی، درد والم ہی سے رفتہ رفتہ اضافی اطلاقیت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ اطلاقیت گویا نفس کی تحدیدات سے رہائی ہے، ذمائم اخلاقیہ تحدید ہی کا نتیجہ ہین، صفاتِ حسنہ کا پیدا کرنا مشقتون کا برداشت کرنا ہے، تحمل مشاق موجب الم ہوتا ہے، لیکن ایک دفعہ جب صفاتِ حسنہ پیدا ہوجاتے ہین، تو انسان ترفع محسوس کرنے لگتا اور ہزارون غمون سے نجات پاتا ہے، گو درد وغم کو وہ فطرۃً مکروہ سمجھتا ہے، لیکن نتائج سے واقف ہونے کے بعد وہ حق تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق کرنے لگتا ہے، کہ

عسی ان تکرھوا شیئًا ویجعل اللہ فیہ خیرًا کثیرًا، — یعنی شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ نے اس مین خیر کثیر رکھی ہو،

اولیا پر جو بلائین نازل ہوتی ہین، وہ ان کے درجات کے ارتفاع کے لئے ہوتی ہین، حق تعالیٰ انھین اپنا قرب عطا کرتے ہین، فقر وتہیدستی مین انھیں مبتلا کرتے ہین، درد وحزن ان پر طاری کرتے ہین، ان سے ارشاد ہوتا ہے، کہ البلاء کنز من کنوز الجنۃ لا یعطی الا باولیاء، عشاق بلا کی اہمیت وقیمت سے واقف ہوتے ہین متمنی وار وہ اس کے طالب ہوتے ہین، کہ

درد قدح درد کہ آن می باید — درد کہ زتست بیشتر می باید

نخست عجب لیک بس خوش خوار است — ہر چند ہمی خورم دگر می باید!

کبھی وہ اپنے ساتھیون کو یہ کہکر تسکین دیتے ہین، کہ

بفقر وتہیستی یک دو روزہ خوش می باش — کہ یار خود ز کرم عذر خواہ می گردد!

ان کے نزدیک جان کے مقابلہ مین تن کی زیادہ قدر نہین اور جان کی قدر پر توجہ ان کی وجہ سے تن اگر تکلیف مین ہو، لیکن جان جانان کے مراد کے مطابق ہو، اور اس کے جمال سے کیف اندوز تو پھر تن کی تکلیف کی کیا شکایت! اسی لئے بلا مین یہ عوام کالانعام کے خلاف

(۱) کسی غیر کے آگے شاکی نہین ہوتے، اور اپنی تنگ دلی کا کسی کے سامنے اظہار نہین کرتے، کیونکہ وہ جانتے ہین، کہ فانھم لن یغنوا عنک من اللہ شیئًا۔

ستم کشان محبت دم از فغان بستند

گرہ ز جبہ کشادند و بر زبان بستند

(۲) اپنے باطن مین اتہام اپنے رب پر نہین رکھتے، اس کی حکمت بالغہ مین انھین کوئی شک نہین ہوتا، وہ حق تعالیٰ سے یہ خطاب سنتے ہین،

باور و بساز چون دواے تو منم — در کس منگر کہ آشناے تو منم

گر بر سر کوے عشق ما کشتہ شوی — شکرانہ بدہ کہ خونبہاے تو منم

(۳) انھین یقین کامل ہوتا ہے، کہ حق تعالیٰ نے جو بات اون کے لئے اختیار کی ہے وہی ان کیلئے دین ودنیا مین اچھی ہے، ع

صلاح ما ہمہ آنست کان تراست صلاح

"حدیث الولی" مین اس آخری نکتہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے، کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہین، کہ میرے بندون مین کوئی ایسا بھی ہے کہ تونگری یا غنا کے سوا کوئی چیز اس کو صالح نہین کر سکتی، اگر مین اوس کو فقیر کردون تو وہ فقر اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے

کہ اس کو فقیری و درویشی کے سوا کوئی چیز نیک نہین بنا سکتی، اگرمین اوس کو غنی کر دون تو غنا اوس کے ایمان کو فاسد کر دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو صحت و تندرستی کے سوا کوئی چیز اس کو درست نہین رکھ سکتی اگرمین اوس کو بیمار کر دون تو وہ بیماری اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے، کہ بیماری کے سوا کوئی چیز اس کے ایمان کو درست نہین رکھ سکتی، اگرمین اوس کو تندرست رکھون تو یہ تندرستی اس کے ایمان کو فاسد کر دے، ابمجھے اپنے بندون کے احوال سے پوری آگاہی ہے، اور مین ان کے مطابق اپنا کام کرتا ہون،

حق تعالیٰ کی ان ہی حکمتون سے واقف ہو کر عشاق ان کی حُسنِ تدبیر، قضاء اختیار سے راضی اور مطمئن رہتے ہین، اور ہر حال میں "رضا بالعطاء اور حفظ حال" کو ضروری سمجھتے ہین، اور قلب کی گہرائیون سے ع

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

کے قائل ہوتے ہین! اسی لئے گو وہ "طبعی غم و اندوہ مین مبتلا ہوتے ہین، لیکن "عقلی سرور" سے اون کے قلب خالی نہین ہوتے، یہ ہے "جمع بین الاضداد" اور "ضدون کی جمع کا یہ ہنر" ان ہی کو آتا ہے! رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ!

غرض طبعی حزن و غم کے لحاظ سے کلیہ یہ ہے کہ ع

عالم ہمہ درد است و دوامی خواہد!

یہ درد یا تو گناہون اور بدکرداریون کا نتیجہ ہے، یا تطہیر و تکفیر کے لئے وارد ہوتا ہے یا رفعِ درجات کے واسطے عائد کیا جاتا ہے، ابہرحال

لقد خلقنا الانسان فی کبد (ع پ ۳۰) ہم نے انسان کو بڑی مشقت مین پیدا کیا

کے کلی قانون کا کوئی استثناء نہین دکھائی دیتا، انسان کی ساری عمر محنت اور دکھ غم و اندوہ مین گذرتی ہے سوز و الم مین بسر ہوتی ہے، وہ ایک موج بیقرار کے مانند ہے، جس کی ماہیت ہی مین پیچ و تاب ہے، چنانچہ اقبال نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے ؎

چہ پرسی از کجا یم چیستم من؟ بخود پیچیدہ ام تا زیستم من

درین دریا چو موجِ بیقرارم اگر بر خود نہ پیچم نیستم من!

لیکن جیسا کہ اوپر واضح ہوا درد و غم سوز و الم بے معنی نہین، بغیر مقصد و غایت کے نہین، اس کا مقصد خودی کی تعمیر ہے، قوتِ حیات کی توفیر ہے، اسی مقصود کو پیشِ نظر رکھنے سے انسان کو طبعیٰ درد کی حالت مین بھی عقلی سرور حاصل ہو سکتا ہے، یعنی اوس کو اپنی جہت سے غم ہی غم ہے، لیکن حق تعالیٰ کی جہت سے سرور ہی سرور، اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف رومی نے فرمایا تھا ؎

چون بدانستی کہ ظلِ کیستی فارغی گر مُردی و گر زیستی

قطرۂ نوری سراپا نور باش بگذر از غم دائماً مسرور باش

فافھم و تدبر!

نواحِ دہلی

کی

اردو کی دو قدیم ترین کتابین

از

جناب ڈاکٹر رشید الدین احمد صاحب بی ایس سی علیگ خانقاہ شعیبیہ تجارہ

صاحبِ گلشن ہند و آب حیات وغیرہ نے شاہ ولی اللہ دکنی اورنگ آبادی متوفی ۱۱۵۵ھ کو زبان اردو کا پہلا شاعر لکھا ہے، جو سید ابو المعالی کے ساتھ بعہدِ سلطنت محمد شاہ ۱۱۳۴ھ میں دہلی آئے چنانچہ لکھتے ہین ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سون،

۱۱۴۲ھ مین اونھون نے مثنوی دہ مجلس لکھی، مثنوی مین ہے،

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال تھا گیارہ سو پہ اکتالیسوان سال

مصنف دکن مین اردو نے وجدی کی مثنوی تحفۂ عاشقان کو ۱۱۰۵ھ کی تصنیف قرار دیکر زبانِ اردو کا پہلا شاعر وجدی کو مانا ہے، مگر بہار منظر مین ہے کہ وجدی مسمی وجیہ الدین قوم شیخ کرنولی کی تحفۂ عاشقان جو مثنوی گل وہرمز عرف گل خسرو فریدی کا ترجمہ ہے، ۱۱۵۲ھ مین، اور پنچھی نامہ یا پنچھی باچھا جو منطق الطیر کا ترجمہ ہے ۱۱۴۲ھ مین اور باغ جانفزا ۱۱۴۵ھ مین لکھی گئی ہین، تحفہ کا ایک شعر یہ ہے ؎

کرون پاک دل ہو زبان پاک سون ثنا یک اس عاشق پاک سون

جواہر سخن مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کی جلد اول مین اردو کا پہلا شاعر وجہی دکنی کو لکھا

گیا ہے، جنھون نے کتاب سب رس نثر میں بزبان دکنی ۱۰۴۵ھ میں لکھی،

تاریخ ادب اردو میں پہلا شاعر محمد قلی قطب شاہ متوفی ۱۰۲۲ھ کو لکھا گیا ہے، ان کا ایک شعر یہ ہے،

بخشا فصیح شعر معانی کے تئین خدا کرتے ہین دعوی شعر کا سب اپنی طبع سون

اور حسب تحقیق دلی الٰہی حضرت شیخ رزق اللہ علوی دہلوی متوفی ۹۸۹ھ نے فارسی مین جن کا تخلص مشتاقی اور ہندی مین راجن ہے بہت اشعار ہندی میں تحریر فرمائے ہین، ہندی مین رسالہ پیمان اور جوت نرجن وغیرہ بھی ارقام فرمائے ہین،

مثنوی واقعات امامیہ لیکن میرے نزدیک اردو کی سب سے قدیم تر مثنوی، مثنوی واقعات امامیہ ہے، یہ مثنوی حضرت شاہ غلام رسول تجاروی[1] برادر حضرت شاہ حافظ منور بایزید ثانی معمر قریشی نے ہمایون کے عہد ۹۳۷ھ میں اردو مین جس کو اس زمانہ مین ہندی کہتے تھے، لکھی چنانچہ مثنوی مین ہے،

ہمایون شہ آن شاہ جمشید جاہ جو ہے حکمران اب بلا اشتباہ

غلام رسول است امیدوار شہا شہریاران مرادش برآر

تجارہ شہر وطن مالوف اوست درین ملک میوات معروف اوست

یہ مثنوی کتب خانہ مجیدی واقع خانقاہ شعیبی مملوکہ و مقبوضہ حضرت صاحب سجادہ نشین خانقاہ شعیبیہ تجارہ آفتاب میوات[2] میں موجود ہے، جس کو عالیجناب میجر سی، ڈبلو ایل ہاروے صاحب بہادر، او بی، ای، ایم سابق پرائم منسٹر ٹونک وغیرہ چیف منسٹر راج الور نے عجائبات مین شمار کرتے ہوئے میوزیم فنڈ سے حفاظت کتب کے لئے ایک سو بیس روپیے مرحمت فرما کر قدردانی کا ثبوت دیا ہے،

---

[1] آپ کا مزار دہلی کی عیدگاہ کے پاس ہے [2] تجارہ پہلے توابع دہلی میں شمار ہوتا تھا، آج کل ریاست الور مین ہے، کتاب صبح گلشن میں تجارہ من اعمال شاہجہان آباد تحریر ہے، اور زیر حکومت فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ مورث اعلیٰ نواب صاحب آف لوہارو کے بھی رہا ہے،

نمونہ کلام اس مثنوی کے چند اشعار یہ ہیں،

الٰہی ترا فضل جو یار ہو / فلک اور ملک سب مددگار ہو

میرے دل مین ہے آرزوے تمام / حقیقت لکھون واقعاتِ امام

بہندی زبان بعض در فرس ہم / نگارش نمودیم ترتیب نظم

کتھا درد دکھ کی جگر سوز ہے / دل افسردہ گان شعلہ افروز ہے

رضاے خدا گر نبودے چنین / ستمگر نہ بستے میان پھر کہین

زمین پیٹ پھٹ کھائی جاتی بدم / فلک ٹوٹ پڑتا نہ با این ستم

غلام رسول آو سر کر سخن / کھڑی خلق تیرے سخن کو سُنن

اردو ہندی کے الفاظ اس مین اردو اور ہندی کے حسب ذیل الفاظ پائے جاتے ہین :-

جتن، آپ روپ، بابا، سر پر، سہاگ، بالی (لڑکی) بالا، اگا، دلہن، راکھے، ساریان، چوک، دونون بل (طرف) تھوں، بھون، بر مین، دہن دہردہ، ہنگا، چٹ، اوکھٹ، کپٹ، ہنٹ، بچن، جھلکن، سوہا، ماتھے، پات لاگو، ہنگورا، کاپن، دلے، اوسان، ہین، کبھو دی، موے، کارنے، ستن، کون، سون، جوں، پٹرا، گدا، پڑھ بڑا، کتھا، سیتی، بہت، کہائی، اُدتی، جادتی، رُدتی، دھوتی، پھرے، پڑھے، پچھانا، پہچانا، بہجایا ہین، بہوت رہت جل (پانی) انجھواں (آنسو) ادگے، اوتر، مذان، پڑ گئے، جیون اور، ترودار، سوگند، باگ (لگام) کتے، کنے، سوانس سور ساونت لایا، بلاک، پہرید (پہن لیا) ایچ کر، انوں، الک، چونب (چوم) انکھیان، بجھ، بنانا، ہتھ، چین، مکھ سون دیدن، اپنا، سنگاتی، گلے لاگ، چاچا، دادیہے، پتاسا، نراسا، انکھیوں، کملا، لوہوہن، کہونرتدی، بچپون کنگ، نک، بچے، اوتا، لاتا، ہول، سرادپرلیا، جگ، بوتا، سورمان، لڑن، مکیاں (مکہ والے) کمس بل پڑدن، راہ دوڑن لگے، گیتے، نینے، جدی، کنے، کرتیان، من ملن، بیاہلی، چہراون، بجادل، رووس، جھیلیں، انے بچن، توت، کملا،

دیوان منعم تجارہی اسی دور کی دوسری کتاب دیوان منعم ہے، اس کے مصنف حضرت مولانا شاہ محمد اشرف عمرانی القریشی المتخلص بہ منعم ہیں، یہ حضرت شاہ غلام رسول مصنف واقعاتِ امامیہ کے بھتیجے تھے، یہ دیوان بھی مذکورہ بالا لائبریری مین موجود ہے، اس کے اشعار کا نمونہ یہ ہے،

نمونۂ کلام

دیکھ کر اس قد موزون کو بس شرم کے ساتھ / گڑ گیا خاک میں سرو آج گلستان کے بیچ

ہے پیچ و تاب مین سنبل کا دل بی دیکھ / سُن کر صبا سین طرۂ دستار کی خبر

شمع اس یار کے رخسار کون دیکھ / ہوئی فانوس مین جل کر کے رو پوش

ٹک ایک تو جیت مت کھو عمر ضائع / نہین بہتر ہے منعم خواب خرگوش

رونق نہین ہے صفحہ کی جدول بغیر دیکھ / ایسے ہی حُسن کے تئین دے ہے بہار خط

کونسا معشوق ہے جگ مین جلے عاشق کیساتھ / اس قدر عاشق نوازی کون ترے جاتی ہو شمع

ابر ہے سبزہ ہے اور خندان ہے گل گلشن کے بیچ / حیف ہے اس وقت میں ساقی نہیں دیتا ایاغ

رات دن ہے شوق سیں گل کے چمن میں پابند / سب غلط ہے جو کوئی کہتا ہے سرو آزاد ہو

منعم ہو عاشقان میں اس وقت کا سلیمان / دیو گر اپنی اسکون انگشتری نشانی

اردو اور ہندی کے الفاظ بل گئے، جھکجھورے، بسرام، بسر، مان سون، لگ، سیں، سیتی، جاگین زدو لوں، جوں، باج، کھوٹا، بتاں، لباں، بوتے، (بت) گلے ہار، بوجھ، تین، نین، نین، تس پی، سجدا تد، تدبہر، جد، بہیر، (پھر) جپک، ٹک، جیت، انے آگیں، جھلکا، صحبت برار، جگ دو ہین، آجادان بوجھتی، آنکھاں، پریت، پاؤتی، تربیتگی، سرخوشی، پڈی، اٹکلا، سیئں، کبھو، بوتے، (بت) جاتا رہ دیو (دیکھ) تجھ اوپر، پٹرو، حوش نیں، جاکہا، جیو، من، لگن، اگن، لکھن، تیکھی، نہٹ، بہنک، پڑھ گھل ل، جھیلیں، اپتے، اپنا، کیدھر، ادڈ گئے، وسکا، جس، اُدر، تجن، ساجن، انند، کے

یا نام نذاب وغیرہ،

سلسلۂ رسولیہ کے متعدد بزرگ ارشاد و ہدایت کے ساتھ صاحبِ علم بھی تھے، حضرت شاہ غلام رسول نے مثنوی واقعاتِ امامیہ تصنیف فرمائی، مولانا شاہ محمد اشرف، حضرت خواجہ محمد ارشد فردوسی، حضرت مخدوم محمد شیب قریشی، حضرت مخدوم محمد یونس احمد قبلہ نما صاحبِ دیوان تھے، ان سب کے دیوان اردو میں ہیں حضرت شیخ الحدیث مولانا مفتی حافظ اجیر الدین نے الہ آباد میں مدرسۂ اسلامیہ قائم فرمایا آپ حضرت مولانا محمد حسین صاحب مرحوم الہ آبادی کے استاد بھی تھے،

تاریخ صقلیہ جلد اوّل

مسلمانوں نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی، اور اسپین کی طرح اس کو بھی اسلامی خیر و برکت کا سر چشمہ بنا دیا، اور تقریباً پانچسو برس تک اس سے وابستہ رہے، مگر افسوس ہے کہ اس کی کوئی تاریخ اردو انگریزی میں کیا عربی میں بھی موجود نہ تھی، چھ سات برس کی مسلسل محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد دو ضخیم جلدوں میں اس کی تاریخ مرتب کی گئی ہے، اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی اور جزائر سسلی پر سلطانی حملوں کی ابتدا، اسلامی حکومت کا قیام، عہد بعہد کے دوروں کا عروج، اور مسلمانوں کے مصائب و جلا وطنی کا مرقع دکھایا گیا ہے، قیمت :- للعہ/ ۵۴۶ صفحے،

سیر الصحابہ جلد ششم

اس میں عہد صحابہ کی چار اہم ہستیوں حضرت حسینؓ، امیر معاویہؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ کے مفصل حالات وسوانح، اخلاق و فضائل اور ان کے مذہبی اخلاقی اور سیاسی مجاہدات اور کارناموں اور ان کے باہمی سیاسی اختلافات کی تفصیل ہے، واقعہ کربلا اور امیر معاویہؓ کے متعلق اردو میں اس سے زیادہ مستند اور تحقیقی حالات نہیں مل سکتے، قیمت ہے

"منیجر"

طبِ فرشتہ

از

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خان شروانی

ذی الحجہ سنہ حال کے معارف میں عزیزی مولوی سید ابو ظفر نے طبِ فرشتہ پر ایک مقالہ لکھا ہے، اون کے پیشِ نظر نسخہ دوسرے مقالے پر ختم ہو جاتا ہے،

میرے کتبخانہ میں بھی ایک نسخہ طبِ فرشتہ "دستور الاطبا" کا ہے، سنِ کتابت اس پر بھی نہیں ہے، ایک جگہ لوح پر یہ عبارت تحریر ہے:-

"طب فرشتہ حکیم عسکری در سنہ ۱۱۹۱ ابتیاع نمود برائے اولاد خود"

اس سے معلوم ہوا کہ کم سے کم دو سو برس کا لکھا ہوا یہ نسخہ ہے، اس میں تین مقالے ہیں، تیسرا مقالہ معالجات میں ہے جس میں ۱۶۰ فصلیں ہیں، یہاں کے نسخے میں ۱۵۷ (ایک سو ستاون) فصلیں ہیں، اخیر کی تین فصلیں نہیں ہیں، اخیر فصل اس نسخے کی تپ کے علاج پر ہے، اسی فصل پر یہ نسخہ ختم ہو جاتا ہے،

خیام

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ، اور فارسی رباعی کی تاریخ اور رباعیات خیام پر مفصل مباحث اور آخر میں خیام کے چھ عربی و فارسی رسالوں کا ضمیمہ اور اس کے قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام کے مباحث پر اس سے زیادہ مفصل، مکمل اور محققانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی، قیمت مجلد للعہ غیر مجلد :- ہیر

ضخامت :- ۵۲۰ صفحے،

"منیجر"

استفسار وجواب

مسلمان سلاطین کے لوازم شاہی

تخت تاج، چتر و علم

پروفیسر غلام مصطفےٰ خان صاحب
کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار)

مخدومی و مکرمی دام ظلکم

"قدمبوسی و سلام مسنون عرض ہے، ایک بات کے لئے آپ کو تکلیف دیتا ہون ۔"

بہرام شاہ غزنوی کی مفصل تاریخ بفضلہ تعالیٰ لکھ لی ہے، مجھے بعض شعراء کے اشعار ملے ہین جو ابراہیم غزنوی (المتوفی ۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء) اور اس کے بعد کے سلاطین کے متعلق ہین، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غزنویون کا علم سیاہ تھا، اس پر شیر اور ہلال کی تصویر تھی، تاج سفید تھا، اور چتر سیاہ تھا، آداب الحرب (ضمیمہ اورنٹیل کالج میگزین ص ۵) سے معلوم ہوتا ہے، کہ چتر پر باز تھا، جیسا کہ سنجر کے یہان بھی تھا، (کلیاتِ انوری، سنہ ۱۸۸۰ء ص ۱۰۳)

شیر علم کے متعلق رونی (ص ۶۱) کہتے ہین :-

چو شیر رایتِ شیرِ دلیرِ او بیدل — چو شاخ آہو شاخ درختِ اوبے بر

صفحہ ۹۰ مین کہتے ہین :-

در جہد باس او بشیر فلک — اگر اندر شود بہ شیر علم

سنائی (بمبئی ص ۳۴۰) کہتے ہین :-

آن چنان شیرِ علم سر بفرازد و بشبل — گوئی از چشمہ خورشید کند آب خوری

وغیرہ وغیرہ،

اب آپ سے دو باتین معلوم کرنا چاہتا ہون :-

(۱) ان اشعار مین شیرِ علم سے کیا یہی مراد ہوگی، کہ علم مین شیر کی تصویر تھی؟ یا یہ محض استعارہ ہے؟

(۲) مسلمانون اور بالخصوص غزنوی عہد کے سلاطین کے علم، چتر اور تاج وغیرہ کا حال کہان معلوم ہوگا،؟ کیا کسی صاحب نے اس موضوع پر کوئی مضمون لکھا ہے؟

امید ہے کہ جواب سے جلد سرفراز فرمائین گے، اور تشنۂ علم کی تسکین فرمائین گے،

میرا تہنیت نامہ خدمت مین پہونچا ہوگا، والسلام

معارف :- محترمی زاد لطفکم

السلام علیکم، گرامی نامہ ملا، آپ کے دونون استفسارون کے متعلق حسب ذیل گذارشین ہین :-

۱- بعض سلاطین کے علم مین "سورج" اور "شیر" کی تصویرین دراصل بنی ہوئی تھین، ابھی کچھ دن گذرے کسی مستند کتاب مین یہ روایت نظر سے گذری تھی "کہ برج اسد سے کچھ تفاول لے کر شیر کی تصویر کو علم مین داخل کیا گیا"، آج حوالہ کے لئے یہ روایت بہت سی کتابون مین "تلاش کی لیکن افسوس ہے کہ نہ مل سکی، تاہم اپنے حافظ اور یادداشت کے بھروسہ پر یہ عرض کرسکتا ہون کہ آپ "شیرِ علم" کو استعارہ کے بجائے حقیقت پر محمول فرمائین، اور جن اشعار مین آپ نے غزنویون کے علم کے سیاہ ہونے اور اس پر شیر اور ہلال کی تصویرون کے موجود ہونے کا تذکرہ دیکھا ہے، اس کو بھی حقیقت نگاری پر محمول فرمائین، جب کبھی وہ روایت دوبارہ نظر سے گذرے گی، انشاء اللہ اس کو نقل کرکے ارسالِ خدمت کرون گا، بہارِ عجم مین بھی شیر علم کا مختصر ذکر ملا ہے، چنانچہ مذکور ہے :-

شیر علم ،نقش شیر کو بر علم کہنہ مولوی معنوی ؎

ما ہمہ شیران ولے شیر علم حملہ شان از باد باشد دمبدم (جلد ۲ ص ۱۸۳)

اس کے ساتھ اس سلسلہ مین یہ امر بھی پیش نگاہ رہے، کہ خونخوار درندہ کی تصویر علم پر اس لئے بھی بنائی جا سکتی ہے، کہ علم بردار فوج دشمنون کے لئے خونخوار ثابت ہو،

۲- سلاطین اسلام کے مختلف خانوادون مین جو مختلف شاہی رسوم و مراتب رائج تھے، ان کا مفصل تذکرہ قلقشندی متوفی ۸۲۱ھ کی صبح الاعشیٰ کی مختلف جلدون مثلاً ج ۳ ص ۴۷۲، ۴۹۸، ۵۲۲، ج ۴ ص ۸۰۶ ج ۵ ص ۲۰۶، ۲۲۳، میں ملے گا، اسی طرح مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۸۴، ۲۸۵، اور خطط مصر مقریزی ج ۳ ص ۳۴۰، ص ۳۴۲ وغیرہ میں مختلف مواقع پر شاہی تخت، چتر، تاج و علم غرض جملہ شاہی لوازم کا ذکر آیا ہے،

اردو مین ابھی تک اس موضوع پر کوئی مستقل مضمون نظر سے نہیں گذرا، مذکورہ بالا ماخذ سے ان چیزون کے متعلق ذیل مین سرسری معلومات مرتب کر دیئے جاتے ہین، مزید تفصیلات کی ضرورت ہو تو اصل ماخذ کی طرف رجوع کرین،

ان لوازم شاہی مین مختلف شاہی خانوادون مین کم و بیش مختلف چیزین مثلاً تخت، تاج، چتر، علم، نقارہ، مجیرا، شہنائی، قرنا، خیمہ، سراپردہ، چاوش و تبردار، اور کوتل گھوڑے، اور ان کے چند مخصوص شاہی زین اور گردنی (الرقبہ) وغیرہ مختلف صورتون اور شکلون مین رائج تھیں، اور یہ مختلف شاہانہ موکب و جلوس و مجالس کے موقعون پر استعمال کیجاتی تھین، ابن خلدون ان لوازم پر فلسفیانہ انداز مین نظر ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ

سلاطین ان لوازم کو اپنے کروفر اور دبدبہ و سطوت کی نمائش اور امراء، ارکان دولت اور عامۃ الناس سے اپنے امتیاز و اختصاص کو قائم رکھنے کے لئے استعمال کرتے تھے، ارسطو کے خیال کے مطابق طبل و نقارہ کا رواج ان مین ابتداءً اس لئے ہوا کہ لڑائیون مین اس کی آواز کی ہیبت سے دشمنون کے دل دہلا جائین، علاوہ ازین نغمون کے سننے سے طبیعت مین سرور و نشاط پیدا ہوتا ہے اور اس وقت طبیعت مشکل سے مشکل کام کو انجام دینے

پر آمادہ ہو جاتی ہے، اس لئے عجم لڑائیون اور شاہانہ موکب و جلوس کے موقعون پر نشاط پیدا کرنے کے لئے موسیقی کے مناسب آلات استعمال کرتے تھے، اور عرب اپنی اس ضرورت کو اپنے مطربانہ اشعار سے پورا کرتے تھے، لیکن مسلمان سلاطین نے جب عجمی طریقے قبول کر لئے، تو ان کے تمام شاہانہ لوازم کو بھی اختیار کر لیا، اور شاہی امتیاز و نشان کے لئے چند خاص چیزین مخصوص شکل و وضع کی خاص کر لی گئیں،

تخت جلوس سلطانی کے لئے مخصوص سمجھا جاتا تھا، اس مین بنیادی تخیل یہ تھا، کہ سلطان کی نشست گاہ مجلس کے حاضرین سے بلند رہے، تخت کا استعمال قدیم زمانہ سے سلاطین کے دربار مین رائج تھا، وہ عموماً سونے کا ہوتا تھا، حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کا تخت ہاتھی دانت کا تھا، اور وہ سونے سے منڈھا ہوا تھا، اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہین، سلاطین اس کو اپنی سلطنت کی ترقی کر جانے کے بعد اختیار کیا کرتے تھے، اسلام مین اس کو سب سے پہلے حضرت امیر معاویہؓ نے اختیار کیا تھا، انھون نے اس کو استعمال کرتے وقت لوگون سے یہ کہکر کہ ان کے جسم مین فربہی آگئی ہے، اس کے استعمال کرنے کی اجازت چاہی، چنانچہ لوگون (صحابہ) نے ان کو اجازت دیدی، اور انھون نے اپنے لئے غالباً گدے دار اونچا تخت تیار کرایا، پھر آگے چل کر مسلمان سلاطین نے انھی کا اتباع کیا، ورنہ عربون مین پہلے اس کا رواج نہ تھا، چنانچہ حضرت عمرو بن العاصؓ والی مصر کے متعلق روایت ہے کہ وہ اپنے قصر مین سب عربون کے ساتھ زمین پر بیٹھا کرتے تھے، جب مصر کا مقوقس ان سے ملنے کے لئے قصر مین آتا تھا تو اس کے ساتھ سونے کا ایک تخت بھی آدمیون کے ہاتھ مین اٹھا کر لایا جاتا تھا، اور وہ اسی تخت پر بیٹھا کرتا تھا، اور حضرت عمرو بن العاصؓ اس کے سامنے اپنی جگہ فرش پر بیٹھتے تھے، اور چونکہ وہ مقوقس اپنے یہان کی رسم کی پابندی کرتا تھا، اس لئے حاضرین اس کے اس طرح بیٹھنے کو برا نہ مانتے تھے،

اس کے بعد جب بنو عباس اور عبیدیین (فاطمیین مصر) کا زمانہ آیا تو انھون نے قیصر و کسریٰ کے یہ طریقے خود اختیار کر لئے، (مقدمہ ابن خلدون ملخصاً ص ۲۸۳ و ۲۸۵-۲۸۶)

چنانچہ مسلمان سلاطین کے مختلف خانوادون مین شاہی جلوس کے لئے مختلف قسم کے تخت و کرسی رائج تھے،

بنوعباس کا تخت زمین سے ، فٹ اونچا تھا، فاطمین کا تخت سنگ رخام کا ایک منبر تھا، جیسا کہ جامع مسجدون مین ہوتا ہے، لیکن اس کی پشت علیحدہ سے ہونے کے بجائے دیوار سے لگی ہوئی تھی، اس منبر پر سلطان اہم موقعون پر جلوس کرتا تھا، ورنہ عام دنون مین حریر سے منڈھی ہوئی لکڑی کی ایک کرسی پر بیٹھا کرتا تھا، جو اس تخت شاہی کے پاس رکھی رہتی تھی، (صبح الاعشیٰ ج ۴ ص ۴۴۶)

ان شاہی تختون مین رفتہ رفتہ کس قدر تکلفات بڑھتے گئے، اس کا اندازہ ایران و ہندوستان کے تخت طاؤس وغیرہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے،

تاج، سلاطینِ اسلام مین تاج کا استعمال نسبتہً بعد مین ہوا ہے، موسیٰ بن نصیر کا لڑکا عبدالعزیز اندلس کی فتح کے بعد اس کا پہلا والی مقرر ہوا تھا، اسپین کے سابق فرمانروا راڈرک کی بیوہ ایجیولینا اس کے حبالۂ عقد مین آگئی تھی، عبدالعزیز کے خلاف اندلس کے عربون مین شورش پھیلائی گئی تھی، اور اس پر دو الزامات عائد کئے گئے تھے، جن مین سے پہلا الزام یہ تھا کہ راڈرک کی بیوہ نے جواب ام عاصم تھی، عبدالعزیز سے کہا کہ ہمارے یہان کے حکمران جب تک اپنے سر پر تاج نہ رکھین، وہ حکمران معلوم نہین ہوتے، اس کے پاس جواہرات موجود تھے چنانچہ اس نے انھی جواہرات سے مرصع سونے کا ایک تاج اپنے ہاتھون سے تیار کرکے عبدالعزیز کے سامنے رکھا، عبدالعزیز نے کہا کہ اس کا پہننا اس کے مذہب مین روا نہین، ہے، بایں ہمہ عبدالعزیز ایجیولینا کی دلدہی کے لئے اس کو خلوت مین اس کے سامنے پہننے پر آمادہ ہوگیا، اور خلوت کا یہ راز بعض ذرائع سے جلوت میں پہونچ کر طشت ازبام ہوگیا اور اس کے خلاف ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا، (افتتاح الاندلس ابن القوطیہ ص ۱۱) لیکن مسلمان حکمرانون کی یہ احتیاط کچھ زیادہ دنون تک قائم نہ رہی، رفتہ رفتہ اس کا استعمال شروع ہوگیا، اور اس کا وقار سلطنت کے وقار کے مترادف سمجھا جانے لگا، چنانچہ فاطمین مصر کا تاج "تاج شریف" کہا جاتا تھا، اس تاج مین بہت سے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے، ان مین کا سب سے بڑا گوہر "یتیمہ" کے نام سے معروف تھا، اور وہ وزن مین ، درہم کے مساوی تھا،

(صبح الاعشیٰ ج ۳ ص ۴۷۲)

چتر، شاہانہ جلوس مین سلطان کے سر پر سایہ افگن رہا کرتا تھا، یہ قبہ نما ہوتا تھا، اس کی کمانیان اوپر جاکر سونے کے ایک حلقہ مین پیوست رہتی تھین، فاطمین کے چتر کا کپڑا ان کے لباس شاہانہ کے رنگ سے ملتا جلتا رہتا تھا، چونکہ چتر شاہی خلیفہ کے سر پر بلند رہتا تھا اسلئے وہ بھی بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، چتر افگنی کی خدمت امرائے نامدار مین سے کسی ایک کے سپرد رہتی تھی، (صبح الاعشیٰ المخفا ج ۳ ص ۴۷۲، ۴۸۳، ۴۸۴)

فاطمین کا یہ چتر ایوبین کے قبضہ مین آیا، اور اسی طرح استعمال کیا گیا، ان کے عہد مین اس کا کپڑا زرد حریر کا تھا، جو سنہرے نقش و نگار سے آراستہ تھا، اور "مظلّہ" کے بجائے چتر ہی کہا جاتا تھا، چتر کے اوپر چڑیا کی ایک نقرئی مورتی بھی، جس پر طلا کاری تھی، (صبح الاعشیٰ ج ۴ ص ۷، ۸)

اس سے معلوم ہوا کہ فاطمین کے چتر مین بھی اسی طرح کسی چڑیا کی تصویر تھی، جیسا کہ مبارک شاہ نے آداب الحرب مین غزنویون کے چتر کے متعلق لکھا ہے، کہ اس پر باز بنا ہوا تھا، (ص ۹) عجب کیا کہ فاطمین کے چتر مین بھی باز ہی کی تصویر ہو، غزنویون کے چتر میں باز کی تصویر کے ہونے سے ذہن ایک روایت کی طرف منتقل ہوتا ہے، جس سے شاہی چتر سے باز کے تعلق پر قیاساً ایک رائے قائم کیجاسکتی ہے، مسعودی نے اسپین کے قدیم حکمرانون کے سلسلہ مین یہ دلچسپ روایت نقل کی ہے کہ

اسپین کے یہ عیسائی حکمران جب کشتیون پر سوار ہوتے تھے، تو شاہین شاہانہ سواری پر، سایہ افگن، کشتی کے ساتھ ساتھ اوپر اوپر جلو مین اڑتے ہوئے چلتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ان مین کے ایک حکمران "اذرق" نامی کی کشتی پر شاہین سایہ افگن جا رہے تھے، کہ ایک چڑیا سامنے آگئی، شاہین نے جھپٹ کر اس کا شکار کر لیا، ادم انسانون کے علم مین پہلی مرتبہ یہ بات آئی کہ شاہین شکار بھی کر سکتے ہین، چنانچہ اس کے بعد شاہین کے ذریعہ سے شکار کھیلنے کا عام رواج ہوگیا، (مسعودی ج ۲ ص ۳۶، ۳۷، و ۲۸۰ و ۲۸۱)

اس روایت سے قدر مشترک کے طور پر یہ معلوم ہوا کہ شاہین سلاطین کے جلوس مین ان کے سرون پر سایہ افگن رہتے تھے اسلئے شاہی سوایون سے ان کا تعلق قدیم زمانہ سے ثابت ہوتا ہے اور شاہانہ جلوس مین ان کا

سر پر سایہ افگن رکھنے کا ایک مدعا یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح سوار و پیادہ شاہ کی سواری کے جلو میں اس کی حفاظت اور اس کے مرتبہ کے بڑھانے کے لئے ہوتے ہیں، اس سے طیور کا یہ حکمران فضا میں انہی خدمات کی بجا آوری پر مامور ہوتا ہے،

علم کے متعلق ابن خلدون لکھتا ہے کہ علم عہد قدیم سے لڑائیوں کی نشانیوں میں داخل ہے، میدان جنگ میں اس کی کثرت، اس کے مختلف رنگ اور اس کے طول سے نفسیاتی طور پر دشمن کے دلوں پر خوف و ہراس طاری کرنا مقصود ہوتا تھا اسلام میں عہد نبوی کے آغاز سے اس کو اختیار کیا گیا، چنانچہ غزوات میں علم موجود رہتے تھے، امتداد زمانہ سے اس کے استعمال کے طریقوں میں فرق ہوتا گیا، چنانچہ عہد رسالت و خلافت راشدہ میں صرف لڑائیوں کے موقع پر استعمال کرتے تھے، جب بعد کے خلفاء نے شاہانہ طور و طریق اختیار کئے، اسی طرح علم کو بھی استعمال کرنے لگے، جیسے عجمی سلاطین استعمال کرتے تھے، پھر خلفاء و سلاطین کے علاوہ امراء و عمال بھی اپنی شان و شوکت کے اظہار کے لئے اس سے اپنے جلوس و موکب کی زینت بڑھانے لگے، اور آگے چل کر علم کی کثرت و قلت خلفاء و عمال کے جلوس و موکب میں فرق و امتیاز قائم رکھنے کا ایک ذریعہ بن گئی،

پھر علم کے مختلف رنگوں سے مختلف خانوادوں کی تمیز کیجانے لگی، مثلاً عباسیوں نے اپنے علم کے لئے سیاہ رنگ اختیار کیا، تاکہ وہ ہاشمی شہداء پر اپنے پائدار غم والم کا اعلان کرتے رہیں، اس لئے وہ "مسودہ" کہے گئے، پھر جب بنو ہاشم میں تفریق ہوئی، اور بنو طالب بنو عباس کے خلاف اٹھنے لگے، تو انھوں نے اپنے علم کا رنگ سفید اختیار کیا، اور وہ "مبیضہ" کہے گئے، اس کے بعد المامون نے ہاشمی سیاہ لباس کو چھوڑ کر سبز رنگ اختیار کر لیا، اور اس کے جھنڈے کا رنگ بھی سبز ہو گیا،

دوسری طرف مغرب میں بربری سلاطین صنہاجی وغیرہ نے علم کے لئے کوئی مخصوص رنگ اختیار کرنے کے بجائے رنگین ریشمی کپڑے اختیار کئے، ان کپڑوں پر وہ سنہرا کام بنا لیتے تھے، اس کے بعد جب موحدین کا دور آیا، تو انھوں نے علم و طبل وغیرہ شاہی لوازم کے استعمال کو سلطان کے لئے مخصوص کر دیا، اور دوسرے عمال و امراء کو ان کے استعمال کرنے کی ممانعت کر دی، پھر مختلف سلاطین نے اپنے ذوق کے لحاظ سے اپنے جلوس

کے لئے علم کی مختلف تعداد مقرر کی، چنانچہ موحدین اور اندلس کے بنو احمر سات علم رکھتے تھے، پھر بعضوں نے یہ تعداد بڑھا کر دس کر دی، پھر بیس ہوئی، یہاں تک کہ سو تک پہنچی، چنانچہ ابن خلدون کہتا ہے کہ اس کے زمانہ میں سلطان ابو الحسن جلوس میں سو علم رکھتا ہے، جو سنہرے کاموں سے آراستہ، رنگین ریشمی کپڑوں کے ہوتے ہیں، پھر اسی زمانہ میں ولاۃ، عمال، اور قواد کو سفید کتان کے صرف ایک چھوٹے علم اور صرف ایک چھوٹے نقارہ کی اجازت دی گئی، وہ لڑائیوں کے موقعوں پر بھی اس ایک علم سے زیادہ علم میدان جنگ میں نہیں لیجا سکتے تھے،

اسی طرح سلاجقہ کے یہاں ابتداً صرف ایک بہت بڑا علم رہتا تھا، جس کے سرے پر بالوں کا گندھا ہوا ایک بڑا گچھا ہوتا تھا، یہ علم خاص سلطانی نشان سمجھا جاتا تھا، اور "شاشتی" کہا جاتا تھا، اور چھوٹے چھوٹے علم بھی ہوتے تھے، وہ "سنجق" کہے جاتے تھے، (مقدمہ ابن خلدون ص ۲۸۴، ۲۸۵)

فاطمیین کا علم جیسا کہ ابن خلدون کے بیان میں اوپر گذرا، سفید رنگ کا ہوتا تھا، ان کے جھنڈوں میں دو سب سے اونچے ہوتے تھے، وہ "لوائے احمد" کہے جاتے تھے، یہ دونوں دو لمبے نیزوں میں ہوتے تھے، جو انی نوکوں تک سونے کے خول میں ڈھکے ہوئے تھے، ان دونوں کے اوپر سفید حریر کی دو جھنڈیاں جن پر سونے کے بوٹے کڑھے ہوئے تھے، ہوتی تھیں، یہ جھنڈیاں ان نیزوں میں لپٹی رہتی تھیں، جلوس میں یہ دونوں علم دو ممتاز امیروں کے ہاتھوں میں ہوتے تھے، پھر ان دونوں علم سے دو پست نیزے ہوتے تھے ان کے سروں پر ٹھوس سونے کے ہلال ہوتے تھے اور ان میں سے ہر ایک میں سرخ اور زرد رنگ کے سات دیبا ہوتے تھے، پھر ان کے پیچھے پیچھے، نازک نازک رنگین جھنڈیاں بوٹے دار حریر کی ہوتی تھیں، جن پر آیت کریمہ "نصر من اللہ و فتح قریب" کڑھی رہتی تھی، (صبح الاعشی قلقشندی ج ۳ ص ۴۷۴، ۴۷۵)

موحدین کے پرچم کی تصویر لیبان کی تمدن عرب کے اردو ترجمہ میں شائع ہوئی ہے، اس پرچم میں آیات قرآنی سے نقش و نگار بنائے گئے ہیں (تمدن عرب ص ۱۳۳)

اسی طرح بنو مرین کا علم سفید حریر کا ہوتا تھا، جس پر دائرہ کی شکل میں سنہرے حروف میں آیات قرآنی نقش کیجاتی تھیں، (ایضاً ج ۵ ص ۲۰۶)

طبل وديگر لوازم شاہی مین موسیقی کے آلات، نقارہ، قرنا، شہنائی وغیرہ کا رواج عہد رسالت وخلافت راشدہ مین نہ تھا، ابن خلدون نے یہ صحیح لکھا ہے کہ اہل حق کے لئے اس دور مین ان لوازم کی حاجت نہ تھی، کہ وہ ان کی مدد سے میدان جنگ مین کامیابی حاصل کرین، جب خلافت بادشاہت مین منتقل ہوگئی، تو دیگر لوازم کے ساتھ رفتہ رفتہ یہ چیزین بھی مسلمانون کے تمدن مین داخل ہوگئین، اور سلاطین کے مختلف خانوادون مین یہ چیزین استعمال کی گئین، موحدین نے جس طرح علم پر پابندی عائد کی تھی، طبل ونقارہ پر بھی پابندیان عائد کردی تھین، پھر امرا کو جب ایک علم استعمال کرنے کی اجازت دیگئی تو طبل وبجیرے کے استعمال کی ممانعت اٹھالی گئی، پھر وہ لڑائیون اور جلوسون مین کثرت سے استعمال کئے جانے لگے، (مقدمہ ابن خلدون ۲۸۴-۲۸۵)

مختلف خانوادون مین طبل ونقارہ کس قسم کے تھے، اور کیا خصوصیات تھے، قلقشندی نے ان کو جابجا لکھی ہے، اسی طرح چند دیگر لوازم تھے، مثلاً فاطمین کے یہان ایک عصاے شاہی تھا، یہ ڈیڑھ بالشت کا ایک دستہ تھا، اس پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا، اور موتیون اور جواہرات سے مرصع تھا، اسی طرح مرصع تلوار، دوات، نیزہ، گھوڑے کی اطلسی زین اور قیمتی جواہرات یاقوت وغیرہ سے مرصع طلائی زیورات وغیرہ سے آراستہ وپیراستہ دیوارون سے شاہی جلوس کی زینت بڑھائی جاتی تھی، اسی طرح سلطانی سراپردہ وخیمہ وخرگاہ وغیرہ تھے، قلقشندی اور مقریزی وغیرہ نے ان لوازم شاہی کی تفصیلات کے ساتھ سلاطین کی تخت نشینی اور شاہی موکب وجلوس کے مختلف مراسم جزئی تفصیلات کے ساتھ بیان کئے ہین، اگر ان امور کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہو تو براہ کرم اصل مآخذ کی طرف رجوع کرین، (صبح الاعشیٰ ج ۳ ص ۴۷۲، ۳، ۴، ج ۴ ص ۷، ۹ و خطط مقریزی ج ۳ ص ۳۴۰، ۳۴۴، ۳۴۳ وغیرہ)

افسوس ہے کہ غزنوی عہد کے متعلق بتخصیص معلومات ہمارے پیش نظر مآخذ مین دستیاب نہ ہوسکے، اگر ان معلومات کے لئے غزنوی عہد کی پوری تاریخ بالاستیعاب دیکھی جائے، اور موقع بہ موقع سے معلومات اخذ کئے جائین، تو وہ فراہم ہوسکتے ہین، غزنویون سے متعلق کوئی ایسا ماخذ ہمارے سامنے موجود نہین، جس مین ان کے

یہ احوال جداگانہ طور پر قلمبند کئے گئے ہون،

ہندوستان کے عہد تغلق پر تفصیلی معلومات قلقشندی نے صبح الاعشیٰ مین لکھے ہین، جو ایک مقالہ کی صورت مین "ہندوستان آٹھوین صدی ہجری مین" کے عنوان سے ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء کے معارف مین راقم سطور کے قلم سے مرتب ہوکر شائع ہوچکا ہے، اس مقالہ کے مطالعہ سے اس عہد مین ہندوستان کے شاہی لوازم کا اجمالی علم حاصل ہوتا ہے، مثلاً دربار عام کے سلسلہ مین مذکور ہے:۔

سلطان ہفتہ مین ہر سہ شنبہ کو دربار عام منعقد کرتا ہے، اس دربار کے لئے ایک بہت بڑا وسیع ایوان مخصوص ہے، جو ہر قسم کے تکلفات سے آراستہ وپیراستہ رہتا ہے، صدر مین ایک نہایت بلند مرصع تخت زرنگار بچھا ہوتا ہے، سلطان اسی پر جلوس کرتا ہے، دائین بائین، ارباب حکومت ایستادہ رہتے ہین، پشت پر ہتھیار بند اسلحہ دار اور سامنے ارباب وظائف واہل مناصب حسب حیثیت ومرتبت کھڑے رہتے ہین، سلطان خود سات دروازون کے اندر بیٹھتا ہے، باریاب ہونے والون کو پہلے ہی دروازہ پر سواریون سے اتر جانا پڑتا ہے،......

پہلے دروازہ پر بوق وطبل کا اہتمام ہوتا ہے، جب معزز عہدہ دار حاضر بارگاہ ہوتے ہین، تو ان کی شان امتیاز کے لئے وہ بجائے جاتے ہین، شاہی جلوس بڑے تزک واحتشام سے نکلتا ہے، ایک شخص گھوڑے پر سوار تاج شاہی پر چتر لگائے رہتا ہے، سلاح دار زرق برق لباس مین ملبوس اپنے چمکیلے ہتھیار سنبھالے ہوئے سواری کے پیچھے ہوتے ہین، دائین بائین تقریباً ۱۲ ہزار خدام پاپیادہ رہتے ہین، سواری کے آگے طبل بجتا ہے، طبل مین ۳۰۰ نقارے، ۴۰ کوس، ۲۰ بوق اور ۱۰ اچنگ ہوتے ہین، سلطان کے ساتھ دوسرے اعیان حکومت اپنے اپنے امتیازی جھنڈون کے ساتھ ہمرکاب ہوتے ہین، بعض خوانین کو سات سات جھنڈے رکھنے کی اجازت ہوتی ہے، ان اعیان حکومت کے چند دیگر امتیازات خصوصی بھی ہوتے ہین، مثلاً خوانین عام طور پر دس کوتل گھوڑے اپنے ہمرکاب رکھ سکتے ہین، اور امرا کو صرف ۲ کوتل گھوڑون کی اجازت ہوتی ہے، حالت جنگ مین سلطان کے سر پر سات چتر لگائے جاتے ہین، جن مین سے دو خصوصیت کے ساتھ نہایت مرصع مطلا اور مذہب ہوتے ہین،

ہندوستان کے عہدِ مغلیہ کے شاہی لوازم کو ابوالفضل نے آئینِ اکبری مین کم و بیش "شکوہ سلطنت" کے زیرِ عنوان یکجا کر دیا ہے، آپ اس کی طرف رجوع کر سکتے ہین، چنانچہ اورنگ سلطنت سونے اور چاندی کا مرصع تخت تھا، ہندوستان کا تخت طاؤس شہرتِ عام رکھتا ہے، اردو مین "تختِ طاؤس" کے نام سے ایک مستقل کتاب بھی لکھی جا چکی ہے، چتر بے شمار قیمتی جواہرات سے مرصع تھا، ابوالفضل لکھتا ہے کہ چتر مین کم سے کم سات جواہرات کا موجود ہونا ضروری تھا، آفتاب گیر کے نام سے جواہرات سے پورا مرصع زربفت کا شامیانہ تھا، جو دھوپ کے وقت سر پر راہ مین سایہ افگن رہتا تھا، علم کی کئی قسمین تھین، علم، چتر، توق، تمن توق وغیرہ یہ مختلف امتیازون کے ساتھ بلند کئے جاتے تھے، چتر توق کا علم تبت کے باز کی دم سے بنایا جاتا تھا،

طبل مین نقارہ، دہل، قرنا، سرنا، نفیر، سنج، اور سینگ وغیرہ تھے، جو مختلف موقعون اور ترتیبون کے ساتھ بجائے جاتے تھے، (آئینِ اکبری) "ر"

روایاتِ معراج

جناب مولوی سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی محترم دام بقائہٗ

جامع مسجد اورنگ آباد ضلع گیا السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ واقعۂ معراج مین حضرت مالک بن صعصعہ رضؓ کی روایت مین سدرۃ المنتہیٰ سے بیت المعمور کو روانہ ہوتے وقت صاحبِ معراج علیہ السلام کے حضور مین شراب (خمر)، دودھ، شہد کا ایک ایک ظرف پیش کیا جانا اور آنحضورؐ کا دودھ کے ظرف کو اٹھا لینا اور حضرت جبرئیلؑ کا فرمانا کہ یہی فطرت ہے، جس پر آپ اور آپ کی امت ہے، اور حضرت انسؓ کی روایت مین بعد فراغت نماز مسجد اقصیٰ سے نکلنے اور آسمان کی طرف روانہ ہونے کے وقت شراب اور دودھ کا ایک ایک ظرف حضور اقدسؐ مین حضرت جبرئیلؑ کا پیش کرنا اور دودھ کا ظرف لے لینا اور حضرت جبرئیلؑ کا فرمانا کہ آپ نے فطرت کو پسند کی ہے،

امام المرسلین ہادی عالم سید اولادِ آدم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور مین حضرت جبرئیلؑ کے ہاتھون خمر جیسی نجس اور حرام شے کے پیش کئے جانے کا منشا صحیح کیا ہو سکتا ہے؟ اس واقعہ سے بعض احباب کے دل مین خلش پیدا ہوتی ہے، اس کا ازالہ ضروری ہے،

۲۔ روایاتِ معراج مین ہے کہ آسمانِ اول پر حضرت آدمؑ اور آسمانِ دوم پر حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور آسمانِ سوم پر حضرت یوسفؑ اور آسمانِ چہارم پر حضرت ادریسؑ، آسمانِ پنجم پر حضرت ہارونؑ، آسمانِ ششم پر حضرت موسیٰؑ، آسمانِ ہفتم پر حضرت ابراہیمؑ سے اور صاحبِ معراجؐ سے ملاقاتین ہوئین، انبیائے نامیدہ کا تقرر باین ترتیب کیا منشا ہے،

اور پھر انہی حضراتِ کرام کا تقرر کیون ہوا، حالانکہ ان کے علاوہ اولوالعزم جلیل القدر صاحب کتاب اور پیغمبران بھی مذکور ہین،

۳۔ انبیائے مذکورین کا تقرر اپنی اپنی منزلون پر بغرض افادہ تھا یا استفادہ؟ اگر افادہ کی غرض سے تھا، تو کیا وہ غرض دیگر انبیاء سے پوری ہو سکتی تھی یا نہین؟ اور نیز مفید کا مستفید سے افضل واکمل ہونا ضرور ہے یا نہین، اگر ضرور ہے تو مستفید کی افضلیت واکملیت خود واقعۂ معراج اور مسجد اقصیٰ میں امامت انبیائے مرسلین سے دیگر صفات وحیثیات سے ثابت ہے، نظر بران کسی صاحب کا یہ کہنا کہ انبیائے مذکورین کا تقرر بغرض افادہ تھا، اور ملاقاتین بغرض استفادہ تھین، کہانتک صحیح ہے؟

معارف:۔ دودھ فطرتِ صالحہ اور شراب فطرت فاسدہ کی جس کا دوسرا نام ضلالت ہے تمثیل ہے، حضرت انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دونون چیزین پیش کی گئین، حضرتؐ نے اپنے اختیار سے دودھ کو جو فطرتِ صالحہ تھی، قبول فرمایا، اور فطرت فاسدہ کو رد فرمایا، حضرت صلعم کی تمثیل ذوقی مین امت کا وجود پنہان تھا، آپ نے اپنی امت کی طرف سے فطرتِ صالحہ کو پسند فرمایا، جس کا دوسرا نام اسلام ہے، فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا،

۲- دوسرے سوال کا پہلا جزیہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام باین ترتیب کیون ہوئے تو ظاہر ہے کہ اس ترتیب مین ابتداء و انتہاء و اوسط کی مناسبت ہے، حضرت آدم علیہ السلام پدر اول، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پدر آخر ہین، اور بیچ کے انبیاء علیہم السلام اخوان ہین،

سوال کا دوسرا جزیہ ہے کہ انہی کا انتخاب کیون ہوا، جواب یہ ہے کہ اوس فطرتی مناسبت کی بنا پر ہوا، جو ان انبیائے کرام علیہم السلام مین فرداً فرداً اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مین مجمعاً تھی،

۳- یہ نہ افادۃً تھا، نہ استفادۃً بلکہ اکراماً للضیف اور استیناساً للمتناسبین تھا،

وَاللّٰہُ اَعلم وعلمہ اتم،

"س"

تابعین ؒ

علم و عمل اور مذہب و اخلاق مین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر ابن عبد العزیزؓ، حضرت حسن بصریؓ، حضرت اویسؓ قرنی، حضرت امام زین العابدینؓ، حضرت امام باقرؓ، حضرت امام جعفر صادقؓ، حضرت محمدؓ بن حنفیہ، حضرت سعید بن مسیبؓ، حضرت سعیدؓ بن جبیر، حضرت محمد بنؓ سیرین، حضرت ابن شہاب زہریؓ، امام ربیعہ رائیؓ، امام مکحولؓ شامی، قاضی شریحؓ وغیرہ چھیانوے ۹۶ اکابر تابعینؓ کے سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور علمی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبہ: شاہ معین الدین احمد ندوی،

ضخامت ۵۰۰ صفحے، قیمت :- للعہ

منیجر

وفیات

آہ! شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ سابق مدرس اعلیٰ دار العلوم ندوہ

حضرت مولانا ابو الحسنات عبد الحیٔ صاحب فرنگی محلی کی آخری یادگار مٹ گئی یعنی اُن کے آخری شاگرد رشید مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب جو ان کی مجلسِ درس کی اکیلی یادگار رہ گئے تھے، ۱۳۶۲ھ کے خاتمہ ماہ مین وفات پا گئے،

مرحوم ۱۸۵۶ء کے آخر مین ضلع اعظم گڈھ کے چھوٹے سے گاؤں بندی مین پیدا ہوئے تھے، غدر ۱۸۵۷ء میں وہ ۲ ماہ کے تھے، اور اسی قدر وہ مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ سے بڑے تھے، ابتدائی کتابین گھر پر پڑھکر وہ اپنے عزیز مولانا سلامت اللہ صاحب جیراجپوری (والد حافظ اسلم صاحب جیراجپوری) کے ہمراہ بنارس تعلیم کیلئے گئے، وہان سے واپس آکر مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں پڑھنے کیلئے گئے اور وہان فارسی کی اونچی کتابیں پڑھین، اس زمانہ میں غازیپور میں حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب فرنگی محلی کے شاگرد رشید مولانا غلام جیلانی صاحب تھے، ان سے ابتدائی عربی کتابیں شروع کین، چند سال مین اُن سے متوسطات تک پڑھکر انہی کے مشورہ سے فرنگی محل لکھنؤ مین مولانا ابو الحسنات عبد الحیٔ صاحب فرنگی محلی کی مجلسِ درس میں حاضر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب دارو غہ حیدر بخش کی مسجد جو چوک میں عربی اور طب پڑھنے والونکا گویا دار الاقامہ تھا، نئی بنکر تیار ہوئی تھی، چنانچہ حضرت مولانا عبد الحیٔ صاحب کی سفارش سے انکو اس کے حجرہ میں رہنے کی جگہ ملی اور یہان کئی سال رہکر معقولات اور دینیات کی تعلیم حاصل کی، فراغت کے بعد جو غالباً ۱۸۸۰ء میں ہوئی ہوگی، وہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے ایک مقامی مدرسہ مین مدرس مقرر ہوئے، یہی سلسلہ ہے جس سے وہ جناب منشی محمد احتشام علی مرحوم رئیس کاکوری سے ملے، اور ایسے ملے کہ پھر ان کے دل الگ نہ ہوئے، اگلے زمانہ میں دوستون کی وضعداریان آج عجیب معلوم ہوتی ہین، چند ہی سال کے بعد ریاست رامپور کی مشہور مدرسۂ عالیہ میں مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب رامپور اہلِ کمال کا مرکز تھا، مولانا عبد الحق خیر آبادی کا وہان طوطی بول رہا تھا، اس عہد مین ان کا وہان جانا،

اور اہل علم کی نگاہوں میں وقار پیدا کرنا معمولی کارنامہ نہیں، دونوں میں نواب صاحب کے سامنے ایک دفعہ کسی فلسفیانہ مسئلہ پر مناظرہ بھی ہوا،

مولانا مرحوم کو زیادہ تر شوق معقولات ہی کا تھا، قدیم فلسفہ و منطق میں بڑی دسترس حاصل کی تھی، ساتھ ہی ریاضیات میں کمال پیدا کیا تھا، چنانچہ رامپور کے زمانۂ قیام میں تصریح پر ۱۳۱۲ھ میں حاشیہ لکھا جو عام طور سے شائع ہے،

رامپور کے زمانۂ قیام میں جنرل عظیم الدین مرحوم کا عہد دیکھا تھا ان کے شجاعانہ کارنامے وہ خوب خوب بیان کرتے تھے، یہ تو رزم تھی، بزم میں جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی مرحوم کی صحبت اٹھائی تھی، ان کے شاعرانہ کمالات اور بعض مشاعروں کے حالات بڑی دلچسپی سے سناتے تھے، آدابِ مجلس سے خوب واقف تھے، اور بڑی مزہ دار باتیں کرتے تھے، لطائف و ظرائف کی بھی کمی نہ تھی، سیر و شکار کا بھی شوق تھا، بڑے تادر انداز تھے،

رامپور سے وہ لکھنؤ آئے اور دار العلوم ندوہ کے افتتاح کے وقت ۱۳۱۷ھ میں وہ اس کے مہتمم اور مدرس اول مقرر ہوئے جس پر وہ ۱۹۰۵ء تک قائم رہے، چنانچہ ان نے اسی زمانہ میں اُن سے مدرسہ دار العلوم میں معقولات و منقولات کی کتابیں پڑھیں، مولانا شبلی مرحوم کے وہ معاصر تھے، اسلئے جب صحبت ہوتی تو دونوں میں خوب نوک جھونک ہوتی، گفتگو کا موضوع کوئی فلسفہ کا مسئلہ یا عقل و نقل کی تطبیق کی معرکہ آرائی ہوتی،

دار العلوم سے وہ ۱۹۰۵ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں گئے ۱۹۲۱ء میں وہاں سے پنشن یاب ہوئے اسی سال وہ حج کو گئے اور وہاں سے واپس آکر لوگوں کے اصرار سے دوبارہ ندوہ کی صدر مدرسی قبول کی اور کئی سال تک یہ خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۳۰ء میں ندوہ سے الگ ہو کر وطن واپس آگئے تھے، اور یہیں ۷ ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ کو وفات پائی،

مولانا عبد الحی مرحوم کی شاگردی کی باوجود مرحوم آخر میں عامل بالحدیث ہو گئے تھے، عدم تقلید کا میلان پہلے سے رکھتے تھے، جو شاید مولوی سلامت اللہ صاحب کی ابتدائی صحبت کا اثر رہا ہو، انکی تصانیف میں تصریح الافلاک کا حاشیہ علمی یادگار ہے، ۱۸۵۵ء کے آخر میں پیدا ہوئے تھے اس حساب سے وفات کے وقت انکی عمر تقریباً ستاسی اٹھاسی سال کی تھی، لیکن دو چار سال پہلے انکی صحت و توانائی قابلِ رشک تھی، اور ان کے جسمانی قویٰ نہایت اچھے تھے ادھر چند برسوں سے البتہ ضعف و اضمحلال کا اثر نمایاں اور آخری زمانہ میں ذہول و نسیان کا غلبہ زیادہ ہو گیا تھا اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے

"س"

ادبیات

غزل

از جناب نجم احسن صاحب ایڈوکیٹ پرتاب گڈھ اودھ

موت ہی اُس کے لئے زیست کا ساماں ہو جائے
آدمی عشق میں مٹ جائے تو انساں ہو جائے

حُسنِ صورت ہو بشر میں تو گلستاں ہو جائے
حُسنِ معنی میں ترقی ہو تو انساں ہو جائے

عشق میں حُسن کی ہر آن نمایاں ہو جائے
عشقِ جاناں ہی اگر جلوۂ جاناں ہو جائے

یا تو محجوب ہی یہ عالمِ امکاں ہو جائے
ورنہ جو کچھ ہے سبھی جلوۂ جاناں ہو جائے

حُسن ہو جائے مرا عشق جو پنہاں ہو جائے
عشق ہو جائے ترا حُسن جو حیراں ہو جائے

مرحلہ دید کا مشکل ہو کہ آساں ہو جائے
چشمِ پُر شوق کو لازم ہے کہ حیراں ہو جائے

ذوقِ آرا کبھی ہو جائے جو رنگینیٔ درد
کچھ تو مخموریٔ احساس کا ساماں ہو جائے

یا خدا جس کو محبت نے کیا ہے برباد
اُس ستم گر کی محبت مرا ایماں ہو جائے

تب اُسے آئیں گے کچھ بادۂ رنگیں کے مزے
شیخِ ظالم جو کبھی صاحبِ عرفاں ہو جائے

بے تامل ترے قدموں پہ فدا ہوتا ہوں
عشق کا فرض یہ ہے حُسن پہ قرباں ہو جائے

کم سے کم دردِ محبت نے نوازا تو مجھے
یا خدا ہر رگِ تن اب تو رگِ جاں ہو جائے

جان لیں کچھ جو ملک منزلِ عصیاں کے رموز
شہپرِ ہر ملک آلودۂ عصیاں ہو جائے

نازِ قاتل تو نمک ریز نمک پاش بھی ہو
زخمِ دل کیوں مرا محتاجِ نمکداں ہو جائے

غیرتِ حُسن کا حق یون ہی ادا ہوتا ہے کیا کرے دیکھنے والا جو نہ حیران ہوجائے

ہر فرشتہ اُسی منزل پہ کرے آکے قیام جو اُسے معرفتِ منزلِ عصیان ہوجائے

آگ ہو جاتی ہے گلزار پئے اہلِ وفا کیون جہنم بھی نہ اب گلشنِ رضوان ہوجائے

کچھ تو احسن کو محبت مین مزے آنے لگین

میرے اللہ یہ کافر بھی مسلمان ہوجائے

بدمستی

از جناب ثاقب گورکھپوری

گُلابیان اُتارے کہ کام ہے دام سے شفق کے سُرخ طاق سے فلک کے سبز جام سے

فلک کی مے سے کام ہو زمین کی مے سے کیا غرض اسی قدر ہے فاصلہ حلال کو حرام سے

عنب کی تاک میں ہو کیا بجز قطارِ آبلہ انہین کا آب مشتہر ہے سب مین مے کے نام سے

وہ شمعِ عقل آندھیون سے جو کبھی بجھی نہین خموش ہوکے رہ گئی ہے اس کے ایک جام سے

بدی ہے مے کی واقعی بنائے بے بدی نہین نہ میرے اجتناب سے نہ تیرے احترام سے

سبو سے انبساط کیون یہی کہ تنگ ظرف ہے خمون کا اشتیاق کیون فقط خیالِ خام سے

ملا دیے ہین ناشناس ساغرِ شراب کو کبھی تو آفتاب سے کبھی مہِ تمام سے

اسی نجس شراب کا تو نام آفتاب ہے مآل مین سیاہ ہے جو زلفِ مشک فام سے

یہ جس گلے مین آگئی اُسی کا دم گھٹا گیا صراحیون کی ہچکیون کو پوچھ گوشِ جام سے

یہ مے کشون کی آرزو ہے ایک خونِ آرزو لہو ٹپک رہا ہے اس کے رنگِ لالہ فام سے

قدم قدم پہ ایک حشر اور پھر جزا نہیں یہ میتین وہی ہین جو اُٹھین نہ احترام سے

اسی خرامِ ناز کا خمار ایک نام ہے نہ چل وہ راستہ جہان خمار ہو خرام سے

جسے شراب کہتے ہین یہی تو شرِّ آب ہے نہ کام سے یہ کام لے بچا زبان کو نام سے

وہ میکدہ فلک کا ہو جو طاہر و طہور ہے جہان مین صبح ہوتی ہے اُسی کے ایک جام سے

مخربِ دماغ ہے سُرورِ بزم و کیفِ مے حواس بھاگتے ہین مسکراتِ زشت کام سے

منشیات بالعموم لائق نفور ہیں

یہ مستفاد مجملاً ہے رشحۂ کلام سے

سوزِ درون

از

جناب اسد ملتانی

ابھی تک تو نہین دینے لگا سوزِ درون میرا بس اتنا ہے کہ اکثر کھولنے لگتا ہے خون میرا

نہین ہین بے خبر احباب میرے زخمِ پنہان سے کہ غمازِ دلِ پرخون ہے اشکِ لالہ گون میرا

جو ہنگامے سے مقصد ہو فقط ہنگامہ آرائی تو ان بے کار ہنگامون سے بہتر ہے سکون میرا

تلاشِ خضر کو سنگِ رہِ منزل سمجھتا ہون وفورِ شوق ہے دستِ طلب مین رہنمون میرا

مین کاخ و کو ہی کر سکتا ہون شو رہا و ہو بر پا نہین ہے پائے بندِ وسعتِ صحرا جنون میرا

زمانے کی نظر کو دیکھکر حیران رہتا ہون اُسی پر داد ملتی ہے جو ہو صیدِ زبون میرا

وہی مومن ہے جس کو دیکھکر باطل پکار اُٹھے کہ اس مردِ خدا پر چل نہیں سکتا فسون میرا

اسد ذوقِ سلیم و چشمِ روشن کی علامت ہے

نئی تہذیب کی محفل میں جامِ واژگون میرا

باب التقریظ والانتقاد

انگریزی ترجمۂ قرآن مجید مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی اعظم گڈہ

اس زمانہ مین جب مسلمان نوجوانون کے اندر براہ راست صحیفۂ اسلام کے ذریعہ سے اسلام کے مطالعہ کا شوق روز افزون ہے، اس بات کی سخت ضرورت تھی، کہ قرآن پاک کا کوئی ایسا ترجمہ ان کے ہاتھون مین ہو جو تاویلات بعیدہ اور زمانہ کے تغیرات کے مطابق رنگ آمیزی سے بالکل پاک ہو اور قرآن پاک کو بعینہٖ اسی رنگ اور اسپرٹ مین پیش کرے جس مین وہ صدر اول مین سمجھا جاتا تھا،

انگریزی مین اس وقت تک دو قسم کے ترجمے ہین یا تو وہ عیسائیون کے کئے ہوئے ہین جن کے متعلق اظہار رائے کی ضرورت نہین، یا بعض ایسے لوگون کے قلم سے نکلے ہین جن کے عقائد و افکار سے جمہور اسلام کو موافقت نہین، مسٹر عبد اللہ یوسف علی کا ترجمہ جو ابھی حال میں شائع ہوا ہے، بے شبہ بہت حد تک ان مفاسد سے بری ہے لیکن اعلیٰ انشا پردازی کے تخیل نے مترجم کو اس بات پر مجبور کیا ہے، کہ قرآنی الفاظ کی پابندی کے بجائے حاصل مطلب پر قناعت کرے، اسی طرح مسٹر محمد پکتھال کا ترجمہ بھی اولاً تو اغلاط سے پاک نہین ثانیاً اس مین بھی یہی نقص ہے، ان حالات کی موجودگی مین ایک ایسے ترجمہ کی حاجت تھی، جو کسی صحیح الخیال اور پابند دین مترجم کے قلم سے نکلا ہو، اور جمہور اسلام کے معتقدات کے مطابق ہو، لفظون کے حدود سے باہر نہ ہو، اور جس کے حواشی مین

موجودہ زمانہ کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو اور جس کی زبان بھی صاف ستھری اور عام پسند ہو،

جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی بی اے، جن کو ہم مدت تک فلسفی کی حیثیت سے جانتے رہے، اور جن کی اردو تصنیفات ادب اور دانش کا مجموعہ مین جب سے ان کے مذہبی خیالات مین انقلاب پیدا ہوا، اور وہ فلسفی سے صوفی بنے، ان کے قلمی فیوض سے اپنے کو محروم سمجھ رہے تھے، لیکن چند سال کی خاموشی کے بعد ان کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہمارے سامنے آیا اور یہ قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ ہے جس کی تیاری مین وہ کئی سال سے مصروف تھے جس کو وہ تکمیل تک پہنچا سکے، اور اب ایک ایک پارہ کرکے تاج کمپنی لاہور کے ذریعہ سے شائع ہو رہا ہے، اور اس وقت اس کا پہلا حصہ جو پارۂ اول الٓمّ پر مشتمل ہے، ہمارے سامنے ہے، اس ترجمہ کو دیکھ کر ہم کو بڑی خوشی ہوئی، کہ مولانا نے وقت کا ایک اہم کام کیا اور مسلمان نوجوانون کے ہاتھون مین ہدایت کا ایک چراغ دیدیا، اس ایک پارے کو دیکھکر اس ترجمہ کی حسب ذیل خصوصیات نظر آئین،

(۱) زبان صاف ستھری صحیح اور فصیح ہے، لیکن نہ بہت اونچی ہے اور نہ بہت نیچی ہے، اور اس بنا پر اس سے معمولی انگریزی دان بھی اسی طرح فائدہ اٹھا سکتے ہین جس طرح اعلیٰ انگریزی کے تعلیم یافتہ،

(۲) مترجم نے ترجمہ مین مقدس بائبل کی زبان اور محاورات کی پابندی کی ہے، گو موجودہ زمانہ کے بعض کم فہمون کو یہ بات قابل اعتراض نظر آئے گی، لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہین کرنی چاہئے، کہ مقدس آسمانی کتابون کی زبان اور طرز ادا عام ادبی کتابون کی زبان سے قطعاً الگ ہونی چاہئے، تاکہ پڑھنے والے پر یہ اثر پڑے، کہ وہ عام ادبی کتابون سے بالاتر ایک صحیفۂ ربانی کو پڑھ رہا ہے، جس کا تقدس اور جس کی عظمت زبان اور طرز بیان مین بھی اپنی انفرادیت کی شان لئے ہوئے ہو،

(۳) ترجمہ کی لفظی خصوصیت صرف اہل نظر کو نظر آئیگی، جس قدر زیادہ باریک بینی سے غور کیا جائے گا مترجم کی تلاش اور عربی لفظ کے بالمقابل اس کے صحیح انگریزی مفہوم ادا کرنے کی کوشش جھلکتی ہوئی نظر آئیگی اگر انگریزی کا کوئی لفظ عربی کے بالمقابل ہم معنی ان کو نظر نہیں آیا ہے، تو عام انگریزی لفظ دیکر حاشیہ مین

اس کی تشریح مناسب کردی ہے، مثلاً رب کا ترجمہ انگریزی مین عام طور سے Lords یا Sovereign کیا جاتا ہے، مگر اس لفظ کے معنی مین جو حقیقت ہے، ان دو لفظون مین سے کسی ایک سے بھی ظاہر نہیں ہوتی، ہمارے مترجم نے اس کمی کو اپنے حاشیہ سے پورا کیا ہے،

(۴) اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے، کہ انگریزی انشا پردازی کی خاطر عربی لفظ کے صحیح معنی کو انگریزی لفظون مین بگاڑا نہ جائے، یعنی قرآن پاک کے مفہوم کو اپنی مفروضہ بلاغت اور فصاحت کے لئے برباد نہ کیا جائے،

(۵) جمہور اسلام کے صحیح عقائد اور خیالات کی خلاف ورزی نہ کی جائے، اور موجودہ زمانہ کی عقلیت پسندی اور خلافِ محاورہ منطقیانہ معنی آفرینی اور معجزات اور خوارق کو خلافِ فطرت نہ ثابت کئے جانے کی خاطر سید احمد خان مرحوم سے لے کر مولوی محمد علی لاہوری تک جو کوششین کی گئی ہین، اون سے قطعاً پرہیز کیا جائے،

(۶) ان مسائل اور واقعات کے بیان مین ان عقل پسند مترجمون نے اپنے زعم مین قرآن پاک کو صحیح ثابت کرنے کے لئے جو غلط طریقے اختیار کئے تھے، اُن سے پرہیز کیا جائے،

(۷) عام طور سے اردو اور انگریزی مترجمون نے یہ کیا ہے، کہ مضمون کی وضاحت کے لئے نفس ترجمہ ہی مین بریکٹ کے ساتھ یا بریکٹ کے بغیر الفاظ بڑھائے ہین، موصوف نے اس مین بڑی احتیاط برتی ہے، ایسے موقع پر اونھون نے لفظ بہ حاشیہ دیگر زائد تشریح درج کردی ہے، تاکہ آیت کے صحیح معنون مین انسانی اضافون کا اختلاط نہ ہونے پائے،

(۸) حاشیون کے لکھنے مین موصوف نے بڑی خدمت انجام دی ہے، گویا یہ کہنا چاہئے کہ ان کے ذریعہ سے ایک نیا علم کلام مسلمانون کے ہاتھون آگیا ہے،

(۹) ان حاشیون مین بعض ایسی تحقیقات ہین، کہ جن سے عام طور پر پُرانے ترجمے خالی ہین، اور یہ وہ کوششین ہین کہ جو اونھون نے ایتون کے گرائمر، تاریخ، جغرافیہ اور تورات و انجیل کے بالمقابل موازنون مین صرف کی ہین،

(۱۰) سب سے بڑھکر یہ کہ یہودی اور عیسائی تصنیفات مین قرآنی تائیدات کی جو تحقیقین ملی ہین، ان کو آیتون کے ساتھ موقع بموقع نقل کرتے گئے ہین، اور جدید مستند انگریزی لٹریچر مین بھی جو باتین ان کو قرآن کے لئے مفید نظر آئی ہین ان کو بھی اپنے موقع پر جگہ دی ہے،

(۱۱) عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کے حوالون مین اونھون نے اصل کتابون کے حوالون کو محنت اور کوشش سے تلاش کرکے ان کے باب اور آیت کے نمبر آسانی کے لئے دیدیئے ہین،

(۱۲) سب سے آخری چیز یہ ہے کہ ہمارے انگریزی خوان اصحاب عربی دانی کے کسی درجہ پر ہون، اس تحقیق تقوی اور احتیاط سے عام طور سے یقیناً خالی ہین جو علمائے محققین اور صالحین کی خصوصیت ہے، اس بنا پر یہ چیز اس ترجمہ اور اس کے تشریحی بیانات کی صحت کے لئے بڑی طمانیت بخش ہے، کہ یہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمۂ قرآن اور تفسیر البیان کو سامنے رکھکر کیا گیا ہے،

اس ترجمہ کی ناشر تاج کمپنی ریلوے روڈ لاہور کو بھی مبارکباد دینی چاہئے، کہ اس نے اس زمانہ مین جبکہ کاغذ اور سامان طباعت کی گرانی بلکہ نایابی کا یہ عالم ہے، اس انگریزی ترجمہ کی اشاعت کی ہمت کی ہے، کاغذ اچھا ٹائپ عمدہ اور نیا ہے، اور عربی عبارت کو بھی بلاک کے خوبصورت خط مین شائع کیا گیا ہے، صفحہ کے اوپر اصل مین ترجمہ اور نیچے کسی قدر باریک ٹائپ مین حواشی ہین، عارفی پارہ اس کی قیمت رکھی گئی ہے، ضرورت ہے کہ انگریزی دان مسلمان اس کی خریداری کی طرف توجہ کرین اور اس کا ایک ایک نسخہ منگوا کر مطالعہ کرین،

المنہاج

از جی، ام، ڈی، صوفی، ام، اے، ال، ٹی (الہ آباد) ڈی، لٹ، (پیرس) تقطیع اوسط، صفحہ ۱۳۸، لکھائی، چھپائی، عمدہ، ناشر، شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور، قیمت للعہ

مندرجہ بالا کتاب ہندوستان کی اسلامی درسگاہون کے تعلیمی نصاب کے ارتقاء کی گویا تاریخ ہے جس کو

مؤلف نے ۱۹۳۵ء میں پیرس یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے مقالہ کی حیثیت سے پیش کیا تھا، اور اس پر اُن کو ڈگری بھی ملی تھی، دراصل یہ مقالہ فرانسیسی زبان میں لکھا گیا تھا، ہندوستان کے ارباب علم کے استفادہ کے لئے مؤلف نے اس کا انگریزی ترجمہ کر دیا ہے، جس کو شیخ محمد اشرف ناشر لاہور نے اپنی اور مطبوعات کی طرح اعلیٰ طباعت کیساتھ شائع کیا ہے،

کتاب میں تمہید اور مقالہ کے علاوہ چار ابواب ہیں (۱) ترکوں اور افغانوں کے عہد میں نصاب تعلیم (۲) مغلوں کے عہد میں نصاب تعلیم (۳) برطانیہ کے عہد میں نصاب تعلیم (۴) آزاد ہندوستان کے نصاب تعلیم پر خیالات، آخر میں ماخذ کی فہرست اور اشاریہ ہے، ایک طویل ضمیمہ بھی ہے، جس میں کلکتہ اور بمبئی کے مختلف امتحانات کے مضامین کی تفصیل ہے،

یہ کتاب اس حیثیت سے مفید اور پُر از معلومات کہی جا سکتی ہے، کہ انگریزی زبان میں مسلمانوں کے گذشتہ اور موجودہ تعلیمی نصاب کے خاکے کو مرتب طریقہ پر پیش کیا گیا ہے، جس سے مختلف دور کے نصاب کا تدریجی ارتقا نگاہ کے سامنے آجاتا ہے، مگر جب اس کے پہلے دو ابواب کے ماخذ پر نگاہ ڈالتے ہیں، تو اس کے علمی وقار میں بڑی کمی پیدا ہو جاتی ہے، مؤلف نے ان دو ابواب کے مباحث میں صرف دو کتابوں ان۔ ان۔ لا کی تصنیف "پروموشن آف محمڈن لرننگ" اور مولانا ابو الحسنات صاحب ندوی مرحوم (رفیق دار المصنفین) کی کتاب "ہندوستان کی قدیم درسگاہیں" کو ماخذ بنایا ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں کتابیں اپنے معلومات کے لحاظ سے استفادہ کے لائق ہیں، مگر کسی تحقیقی مقالہ کی ترتیب میں صرف ان دونوں کتابوں کو ذریعہ معلومات بنانا اس کے تحقیقی درجہ کو کم کر دیتا ہے، مولانا ابو الحسنات صاحب مرحوم نے اپنی کتاب کے خاتمہ پر تحریر کیا تھا، کہ "یہ اسلامی عہد حکومت میں ہندوستان کی اسلامی تعلیم اور تعلیم گاہوں کا مختصر سا خاکہ ہے، میں نے علی العموم اجمال و اختصار سے کام لیا ہے، مزید تفصیل و تشریح کی طرف توجہ کیجائے، تو پھر دفتر کا دفتر چاہئے، جس کے لئے نہ موقع ہے اور نہ وقت، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مزید توجہ کے بعد قطرہ دریا بن سکتا ہے" لیکن المنہاج کے مؤلف نے اس قطرہ کو دریا بنانے کے بجائے صرف اس سے پیاس بجھانے پر اکتفا کی، اگر کہیں کسی نئی بات کا اضافہ بھی کیا ہے تو تجدد پسندی اور

روشن خیالی کے جوش میں ان کے بیانات جادۂ مستقیم سے ہٹ گئے ہیں، مثلاً نصاب موسیقی کے سلسلہ میں ان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ موسیقی کی تعلیم کلام مجید، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صوفیائے کرام کی عین تعلیم کے مطابق ہے، (صفحہ ۳۶-۳۷) جو سراسر غلط ہے، ممکن ہے کہ مصنف کو موسیقی سے دلچسپی ہو یا موجودہ تمدن و معاشرت کے زیر اثر اس فن کو تعلیم کا ضروری جزء سمجھتے ہوں، لیکن اس کے لئے انھیں مذہب کو آڑ بنانے کی کیا ضرورت ہے، اگر موسیقی سے مراد خوش گلوئی، خوش الحانی اور ترنم ہو تو اسکی البتہ اسلام نے ممانعت نہیں کی ہے لیکن محض اتنی سی بنیاد پر موسیقی یعنی گانے اور ساز وغیرہ کو جائز بتانا سراسر غلط ہے، مذہبی احکام کی غلط تعبیر سے خواہ وہ حسن نیت ہی سے کیوں نہ ہو، طرح طرح کے مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں، اس قسم کے خطرات کو مدنظر رکھنا ایک محتاط مصنف اور مقالہ نگار کا اولین فرض ہونا چاہئے،

اسلامی دور حکومت کی صنعتی اور فوجی تعلیم پر بھی مباحث ہیں، مگر یہ بہت ہی سرسری اور تشنہ ہیں تیموری عہد میں فوجی تعلیم کے متعلق مؤلف نے گویا صرف اس پر قناعت کی ہے کہ "ابو الفضل کی لکھی ہوئی تفصیلات سے اس تعلیم کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے، جو فوجوں کی مختلف جماعتوں کو دیجاتی تھی"۔ اگر تھوڑی سی محنت اٹھا کر اس فوجی تعلیم کی تفصیل بھی درج کر دیجاتی تو کتاب کا معیار بلند ہو جاتا، حالانکہ اس سلسلہ میں تیموری بادشاہوں اور شاہزادوں کے سپاہیانہ اور بہادرانہ کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے، مگر اس ذکر سے صرف ان کی ذاتی خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے، اس عہد کے لشکریوں کی فوجی تعلیم کا خاکہ سامنے نہیں آتا، عجلت میں مؤلف نے ہندوستان کے بعض اہم مسلمان فرمانرواؤں کے عہد کے تعلیمی نصاب کا استقصا کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا ہے، مثلاً اکبری دور کے فضلا اور علما کا ذکر تو کیا ہے مگر اس زمانہ کے نصاب تعلیم کو نظر انداز کر کے اورنگزیب اور اسکے بعد کے تعلیمی نصاب کی فہرست پر بحث کی گئی ہے، حالانکہ آئین اکبری میں اکبری دور کے نصاب تعلیم کی تفصیل موجود ہے، اسی طرح تھوڑی سی توجہ سے فیروز شاہ کے عہد کا تعلیمی نصاب بھی معاصر تاریخوں سے مرتب کیا جا سکتا تھا، اسلامی دور کی تعلیم نسواں پر بھی کافی معلومات فراہم ہو سکتے تھے اگر صرف مالوہ کے فرمانروا سلطان غیاث الدین ابن محمود خلجی کے عہد میں عورتوں کی تعلیم پر نظر ڈالی جاتی، جزئیات میں بھی کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں،

مگر عام اور سرسری مطالعہ کے لئے یہ کتاب مفید کہی جا سکتی ہے، طرز بیان صاف، رواں اور دلچسپ ہے، "ص ع"

مطبوعات جدیدہ

محمد علی از مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۸۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر،

قیمت ۱۲؍ پتہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن،

مولانا محمد علی مرحوم کی وفات کے بعد مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے مرحوم پر اپنے اخبار سچ میں مضامین کا ایک سلسلہ لکھا تھا، مذکورۂ بالا کتاب میں ان مضامین کو مرتب طریقہ سے جمع کر دیا گیا ہے، مولانا محمد علی مرحوم پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ان مضامین کی حیثیت اُن سے مختلف ہے، مولانا مرحوم اور فاضل مضمون نگار میں خاص ربط و اخلاص تھا، بعض کاموں میں وہ انکے شریک بھی رہے تھے، اسلئے انھیں مرحوم کی خلوت و جلوت، پبلک اور پرائیوٹ زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور اس کا کوئی رُخ اُن کی نگاہ سے مخفی نہیں تھا، ان مضامین میں اسی کی عکاسی کی گئی ہے، اس کتاب میں سنہ ۱۹۱۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۲۴ء تک صاحب سوانح کے جستہ جستہ اجمالی حالات ہیں، اور سنہ ۱۹۲۵ء سے آخر زندگی تک کے کسی قدر تفصیلی، یہ حالات ایک واقعہ نگار کے بیان کی طرح محض تاریخ کی کھتونی نہیں ہیں، بلکہ اس سے مولانا مرحوم کے ملکی و ملی خدمات کے ساتھ ان کے فضل و کمال، ذہانت و ذکاوت، عقائد و خیالات، جذبات و رجحانات، غیرت قومی و حمیت دینی، اخلاص و للہیت، حق گوئی و حق پرستی، مزاج و افتاد طبع ان کے اخلاق و کردار کی پوری تصویر اور ان کی مجاہدانہ زندگی کی پوری روح سامنے آجاتی ہے، مرحوم کے گوناگون اوصاف و کمالات کی اس سے زیادہ جامع مصوری ممکن نہ تھی، اس کو پڑھ کر مرحوم کے مرقعۂ حیات کے تمام خط و خال نظر آجاتے ہیں، سیرت محمد علی کی تالیف کے سلسلہ میں مولانا سے جو سہو ہوا تھا، اس کتاب سے

اس کی تلافی ہو گئی، انداز تحریر کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، مولانا کی سحر طرازی نے خشک تاریخی واقعات کو دلاویز افسانہ بنا دیا ہے، اور اس کتاب کے متعلق یہ فقرہ بالکل صحیح معنوں میں صادق آتا ہے، کہ جب تک ختم نہ ہو جائے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی، یہ ایک ایسے پُرشور دور کے حالات ہیں، جس میں بہت سے اختلافی مسائل پیش آئے، بعض میں خود مؤلف کی حیثیت بھی فریق کی تھی، اس لئے ان مسائل کا زیر بحث آنا ناگزیر تھا، تاہم ان کے رمز شناس قلم نے اظہار حق کے ساتھ سنبھالنے کی پوری کوشش کی ہے، امید ہے کہ یہ کتاب مولانا محمد علی مرحوم کے قدر دانوں اور فاضل مصنف کی تحریروں کے قدر شناسوں میں مقبول ہوگی،

ابو الکلام آزاد، مرتبہ جناب عبد اللہ بٹ صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۳۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ؍ پتہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور،

مولانا ابو الکلام آزاد کی شخصیت کے متعلق مختلف جماعتوں کے متعدد اکابر و ممتاز اشخاص اور بعض عام لوگوں نے بھی تحریری شکل میں اپنے تاثرات ظاہر کئے ہیں، اس کتاب کے لائق مرتب نے ان سب کو اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے، اس سے مولانا کے کمالات کے متعلق مختلف اہل نظر کی رائیں اور اس کے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہیں، اگر اس کتاب کو محض اکابر کے تاثرات تک محدود رکھا جاتا، تو اسکی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ جاتی، مولانا کی ذات ایسی جامع کمالات ہے، اور ان کے واقعی اور صحیح کمالات اتنے گوناگون ہیں، کہ ان میں کسی مزید اضافے کی مطلق ضرورت نہیں، پھر معلوم نہیں بعض مضمونوں میں غیر صحیح واقعات لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے، لیکن ان سے مولانا کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، مثلاً ایک مضمون میں ہے کہ آپ نے قاہرہ کی مشہور عالم یونیورسٹی الازہر میں تعلیم حاصل کی، اور ۱۴ سال کی عمر میں آپنے جامع ازہر میں علوم مشرقی کا نصاب پورا کیا، اور اس قدر استعداد پیدا کر لی، کہ آپ کو مختلف مضامین کے پڑھانے پر مامور کر دیا گیا، یا تذکرہ بیس سال کی عمر میں لکھا۔ ایک دوسرے مضمون میں ہے کہ، سنہ ۱۹۰۵ء میں آپ کو قاہرہ کی یونیورسٹی الازہر میں بھیجا گیا ...... سنہ ۱۹۰۷ء میں آپ عراق و شام و فلسطین کی سیاحت کر کے ہندوستان واپس آئے ص (۳۰۶)" اسی مضمون میں ہے کہ سنہ ۱۹۰۵ء

مین آپ الندوہ کے اڈیٹر تھے، اور ۱۹۰۶ء مین وکیل کے اڈیٹر مقرر ہوئے، حالانکہ مولانا نے اپنے "مولد و منشا و طفولیت" وادی غیر ذی زرع" یعنی مکہ معظمہ سے ہندوستان آنے کے بعد پھر یہان سے باہر قدم نہین نکالا، مضمون کا تضاد بیان بھی دلچسپ ہے کہ ایک طرف تو مولانا کو ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء مین الندوہ اور وکیل کا اڈیٹر لکھا گیا ہے، اور اسی زمانہ مین ان کو الازہر مین بھی دکھایا گیا ہے، درحقیقت مولانا کی شخصیت اور ان کا علم ازہر کی تعلیم سے بلند ہے، کسی درس گاہ کی جانب ان کا تعلیمی انتساب ان کے لئے کوئی سند کمال نہیں ہے، ع

بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبا را

تذکرہ اونھون نے بیس سال کی عمر مین نہین بلکہ اس وقت لکھا جب قافلۂ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہنچ چکا تھا" (تذکرہ ص ۲۸۹) تیس سال کی عمر مین بھی ایسی کتاب لکھنا بجائے خود کمال ہے، ان خفیف فروگذاشتون سے قطع نظر کتاب دلچسپ ہے،

ضرورۃ القرآن حصہ اول از جناب قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت عارؔ پتہ مصنف دار الاشاعت والتصنیف ڈاکخانہ شمس آباد ضلع اٹک پنجاب۔

اس کتاب کا مقصد دنیا کے لئے قرآن مجید کی ضرورت کا اثبات ہے، اس حصہ مین لائق مصنف نے انسانیت اور کائنات کے متعلق بعض اسلامی تعلیمات کو پیش کر کے ان کے لئے مذہب، انبیا، اور الہامی کتابون کی ضرورت دکھائی ہے، ان کی صداقت کا معیار بتایا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل دیئے ہین، اور دوسرے مذاہب کی الہامی اور غیر الہامی کتابون کے نقائص ظاہر کر کے ان کے مقابلہ مین کلام مجید کے کمالات دکھائے ہین، ان مباحث مین مصنف کو موضوع سے متعلق وغیر متعلق ضروری وغیر ضروری اور معتبر وغیر معتبر جس قسم کے معلومات مل سکے ہین ان کو بے کم وکاست نقل کر دیا ہے، بعض باتین نہ صرف غیر ضروری بلکہ ناقابل تحریر تھین، اس حصہ مین اتنی غیر ضروری بحثین آگئی ہین کہ اصل موضوع تشنہ رہ گیا ہے، ممکن ہے دوسرے حصہ مین اس کی تلافی ہو، یہ کتاب مواد، ترتیب اور زبان وبیان مختلف حیثیتون سے نظر ثانی کی محتاج ہے، لیکن

خوش عقیدہ عوام کے لئے مفید ہے، اللہ تعالیٰ مصنف کو ان کے حسن نیت کا صلہ عطا فرمائے،

ہم کیسے پڑھائیں، از جناب سلامت اللہ صاحب ایم اے، معلم جامعہ ملیہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۲۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ؍ مکتبہ جامعہ ملیہ نئی دہلی، اور اس کی شاخین لکھنؤ، بمبئی، نمبر ۳،

بچون کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم ہے، لیکن اب تک اس کی طرف پوری توجہ نہ ہو سکی، یون تو اس کا پورا نظام تعلیم موجود ہے، لیکن وہ جدید قومی ضروریات اور نئے تعلیمی اصولون سے مطابقت نہیں رکھتا، اور نہ اس موضوع پر اردو مین کتابین ہین، غالباً جامعہ ملیہ ایک ایسی درس گاہ ہے، جہان جدید تعلیمی اصولون کے مطابق اس کا عملی تجربہ ہو رہا ہے، اسلئے یہیں کے ایک استاد نے معلمین کی واقفیت کے لئے یہ کتاب لکھی ہے، اس مین تعلیمی مواد یا نصاب تعلیم کے انتخاب اس کے باہمی ربط وتعلق کے اصولون پر بحث کی گئی ہے، اور اس کے قبول کے لئے بچون کی ذہنی تربیت کے طریقے بتائے گئے ہین اور پڑھانے میں مختلف نئے طریقون کو جن کا یورپ وامریکہ مین تجربہ ہو چکا ہے تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، ان مباحث مین ہندوستان کی ضروریات اور یہان کے حالات کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہے، ہر بحث کے آخر مین ماخذ کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے، کتاب کی اصلی خوبی کا صحیح اندازہ تو فن تعلیم کے واقفکار ہی کر سکتے ہین، لیکن بظاہر کتاب مفید تعلیمات پر مشتمل اور اساتذہ ومعلمین کے استفادہ کے لائق ہے،

طریق مستقیم مترجمہ جناب محمد اسماعیل صاحب ایم اے، تقطیع اوسط ضخامت ۹۹ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہین، پتہ:- مطبوعہ نامی پریس، ہیوٹ روڈ، لکھنؤ،

حضرت شیخ ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا مجموعہ کتاب الصدق عربی مین تصوف کی مشہور ومعروف کتاب ہے، اس مین حضرت شیخ نے کلام مجید، احادیث نبوی اور صلحاء واخیار امت کے اقوال وحالات کی روشنی مین تصوف کے مہمات مسائل اور تقرب الی اللہ جملہ قلبی اعمال، اخلاص، صبر، معرفت نفس، معرفت ابلیس، حلال صافی یا اکل حلال، ترک دنیا، خشیت الٰہی، حیا، محبت، رضائے الٰہی، اور انس مع اللہ مین صدق کی حقیقت

اور اس کی تشریح بیان فرمائی ہے، ہر بحث شریعت کی روح اور عرفان و تصوف کا عطر ہے، کتاب اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے، ترجمہ سلیس و روان ہے،

علماے کرام کا مستقبل از جناب منظر الدین صاحب صدیقی بی اے، تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸؍ پتہ اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور،

مصنف حیدرآباد کے سنجیدہ صاحب قلم ہین، اُن کے خیالات مین قدیم و جدید کا معتدل امتزاج ہے، وہ مذہب و ملت کا بھی درد رکھتے ہین، اور زمانہ کے نئے تقاضون پر بھی ان کی نگاہ ہے، اسی ضرورت کے پیش نظر انھون نے علماے کرام کے مستقبل پر غالبًا یہ مضمون لکھا تھا، جسے کتابی صورت مین شائع کردیا گیا ہے، اس مین انھون نے علماے کرام کے منصب اور ان کے فرائض و ذمہ داریون کو دکھایا ہے، اور ان کے جمود و بے حسی، زمانہ کے حالات اور نئی ضروریات سے ان کی ناواقفیت و بے خبری، مسلمانون کی حالت سے ان کی غفلت اور اس کی دوسری خامیون اور کوتاہیون کو ظاہر کرکے مسلمانون کے حق مین اس کے مضر نتائج دکھائے ہین، اور علما، کو اُن کے فرائض کی جانب متوجہ کیا ہے، علما کے فرائض کے بارہ مین لائق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بالکل صحیح ہے، ان کی بعض کوتاہیون اور مسلمانون کی زبون حالی سے بھی انکار نہین، اس سلسلہ مین مصنف کے بعض مشورے یقینًا غور و توجہ کے لائق ہین، لیکن حسن نیت کے باوجود اس بحث مین جابجا ان کا قلم جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا ہے، اور اُن کے دینی احساس پر دور جدید کی تجدید و اصلاح کا غلبہ نظر آتا ہے، ان کے نزدیک شروع سے اب تک تمام علماے کرام نہ صرف مسلمانون کی حالت سے غافل اور خود غرضی مین مبتلا رہے بلکہ انھون نے تجدید و اصلاح کی راہ مین مزاحمت پیدا کی، جو سراسر مبالغہ ہے، مصنف نے مسلمانون کی جو جو خرابیان اور جو جو اصلاح طلب باتین شمار کرائی ہین ان مین دینی نقطہ نظر سے کوئی ایسا اصلاح طلب امر نہین ہے، جس کی اصلاح کی جانب علما نے توجہ نہ کی ہو، پھر نفس تجدید و اصلاح کے بارہ مین بھی مصنف کے بہت سے خیالات محل نظر ہین، مثلاً وہ موجودہ فقہ کو دفتر پارینہ قرار دیتے ہین اور ترکون کی غیر اسلامی

اصلاحات کو بھی جائز شمار کرتے ہین، جدید حالات و مسائل کے حل کی ضرورت سے انکار نہین، لیکن اس کے خاطر فقہ کو دفتر پارینہ قرار دے دینا صحیح نہین، اس فقہ کی اہمیت اس سے کہین زیادہ ہے جتنی مصنف نے سمجھی ہے، بہرحال یہ کتاب بعض خیالات سے قطع نظر غور و توجہ کے لائق ہے،

اسلامی معاشرت از جناب غلام احمد صاحب پرویز تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۶؍ پتہ: نسیم منزل شیدی پورہ قرول باغ نئی دہلی،

کلام مجید مسلمانون کی جملہ دینی و دنیوی ضروریات کا ضابطہ ہے، اس مین مسلمانون کی فوز و فلاح کے مہمات مسائل بھی ہین، اور اجتماعی زندگی مین ایک دوسرے کے ساتھ حسن معاملت اور حسن معاشرت کی ہدایات بھی ہین، اگرچہ یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتین ہین، لیکن انسانی اخلاق و کردار کی تربیت سے ان کا گہرا تعلق ہے، اس لئے اسلام مین ان کی بڑی اہمیت ہے، اور تکمیل اخلاق اسلام کی تعلیم کا بڑا ضروری جز ہے، لائق مؤلف نے اس کتاب مین کلام مجید سے اجتماعی زندگی کی حسن معاشرت اور حسن معاملت کی ہدایات کو جمع کردیا ہے، اور جابجا ضروری تشریح بھی کردی ہے، کتاب مسلمانون کے لئے مفید ہے،

سی پی مین کانگریس راج، از جناب حکیم اسرار احمد صاحب کریوی تقطیع بڑی ضخامت ۳۷۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ پتہ مرزا اسمٰعیل بیگ صاحب جنرل سکریٹری مسلم لیگ ناگپور، سی پی،

کانگریسی وزارت کے دور مین صوبہ متوسط کے مسلمانون کو اس کے خلاف جو شکایتین تھین، اس کتاب مین ان کو مع شواہد و ثبوت کے جمع کردیا گیا ہے، اس مین سرکاری محکمون، لوکل بورڈون، اور کونسل مین مسلمانون کی جو جو حق تلفیان اور ان پر جو زیادتیان ہوئین، ان کی پوری تفصیل درج ہے، بعض واقعات کے ثبوت مین سرکاری دستاویزون کی نقلین بھی شامل ہین، لیکن اب یہ داستان بعد از وقت ہے، البتہ آئندہ کے لئے اس سے حاکم و محکوم دونون سبق حاصل کرسکتے ہین،

آریائی زبانیں

از جناب سدھیشور ورما شاستری ایم اے، ڈی لٹ پروفیسر سنسکرت و لسانیات پرنس آف ویلز کالج جمون، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحے، قیمت ۱ مہ پتہ:- ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن،

لسانیات یا فیلالوجی اپنی خشکی کے باوجود نہایت دلچسپ فن ہے لیکن اردو مین اس موضوع پر مستقل کتابین نہین ہین، بعض ادبی کتابون مین ضمناً کچھ لسانیاتی بحثیں ملتی ہین، لائق مولف نے اس کتاب مین لسانی نقطۂ نظر سے ہندوستان اور ایران کی آریائی زبانون کی مختصر تاریخ، ان کی خصوصیات، ماخذ و ارتقاء عہد بعہد کے تغیرات، ان کی باہمی حرفی و صوتی مشابہت و اختلافات وغیرہ کو دکھایا ہے، ہندوستان کی زبانون پر نسبتہً زیادہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، یہ کتاب اس فن سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے

اپنے خواب

از جناب سید کاظم دہلوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ دفتر کہکشان گلی تاراشاہ دہلی،

مصنف کتاب موجودہ دور کے اچھے افسانہ نگارون مین ہین، ان کے افسانون کے بعض مجموعے اس سے پیشتر شائع ہو چکے ہین، اپنے خواب بارہ افسانون کا نیا مجموعہ ہے، تقریباً کل افسانے رومانی ہین لیکن ان مین حسن و عشق کی محض تفریحی اور بے نتیجہ افسانہ طرازی نہیں ہے، بلکہ روزانہ کے واقعات زندگی، اور ہماری معاشرت کی صحیح تصویرین ہین، افسانون کے پلاٹ دلچسپ، خیالات ستھرے اور زبان پاکیزہ ہے،

مفتاح العربیہ

جزو اول و دوم مؤلفہ احمد بن ناصر العیسری استاذ عربی عثمانیہ ٹرننگ کالج حیدرآباد دکن، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ہر دو حصہ ۱۴ر پتہ:- مصنف سے ملے گی،

مصنف نے عربی زبان کے مبتدی طلبہ کے لئے یہ ریڈرین لکھی ہین وہ اہل زبان بھی ہین اور تعلیم کا بھی عملی تجربہ رکھتے ہین، اسلئے یہ ریڈرین زبان اور تعلیمی نقطۂ نظر دونون حیثیتون سے مفید ہین ان مین روزانہ کی ضروریات کے الفاظ اور اسباق مین تدریج، اور ان کی مشق کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، عربی کے مبتدیون کے لئے یہ مفید ریڈرین ہین،

"م"

جلد ۵۳ ماہ صفر المظفر ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۴ء عدد ۲

مضامین